الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

سچے انسان کی زندگی اصولوں کے تابع ہوتی ہے
اور جھوٹے انسان کی زندگی مفادات کے تابع

جنوری ۱۹۸۷
شمارہ ۱۲۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۲۲ **جنوری ۱۹۸۷**

فہرست

مومن کون صفحہ ۲
ایمان ایک دریافت ۳
دل سے دل تک ۴
انسانی فطرت ۵
اتحاد کا سبق ۶
حق کی تلاش میں ۷
آدمی کی پہچان ۸
یہ اسلام نہیں ؟ ۹
زندگی کا سفر صفحہ ۱۱
بھارت کی تعمیر ۱۲
ایمان پر قائم رہنا ۲۳
تین قسم کے آدمی ۲۴
اختلاف نہیں ۲۵
ایک سفر ۲۶
خبرنامہ اسلامی مرکز ۔ ۲۶ ۴۵
خط انگریزی ۴۷

مومن کون

لوگ چیزوں کو دیکھتے ہیں، مومن چیزوں میں خدا کو دیکھتا ہے۔ لوگ چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، مومن وہ ہے جو چیزوں سے گزر کر خدا تک پہونچ جائے۔ پھل کو درخت سے گرتے ہوئے ہر شخص نے دیکھا ہے۔ مگر جس نے درخت سے پھل گرنے کے واقعہ میں گریویٹی (قوتِ کشش) کو دیکھا وہ نیوٹن بن گیا۔ میٹر (مادہ) کو ہر شخص دیکھتا ہے، مگر جس نے میٹر میں الکٹران کی حرکت کو دیکھا وہ مائیکل فریڈے بن گیا۔ ذرہ ہر جگہ ہے اور ہر شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔ مگر جس نے ذرہ میں نیوکلیر فورس (جوہری طاقت) کو دیکھا وہ آئن سٹائن بن گیا۔ اسی طرح دنیا کو ہر شخص دیکھتا ہے مگر جو شخص دنیا میں خدا کو دیکھ لے وہی مومن ہے۔

بائبل میں ایک تمثیل دی گئی ہے کہ جس کے پاس سننے کے لیے کان ہوں وہ سن لے۔ پس اس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں۔ وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں:

ہم نے تمہارے لیے بانسری بجائی، اور تم نہ ناچے۔ ہم نے تمہارے لیے ماتم کیا اور تم نہ روئے۔

خدا اس دنیا میں ہر وقت اپنی بانسری بجا رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان اس کو سنے اور اس سے سرشار ہو کر رقص کرے۔ مگر انسان عین اس خدائی بانسری کے درمیان بے حس اور بے خبر بنا ہوا پڑا رہتا ہے۔ خدا اس دنیا میں ایسے واقعات ظاہر کرتا ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر تڑپیں، لوگ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کریں۔ مگر انسان اتنا ظالم ہے کہ تڑپانے والے واقعات کو دیکھ کر بھی وہ نہیں تڑپتا، رلانے والے واقعات سے دوچار ہونے کے باوجود وہ نہیں روتا۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا اعتراف کرے۔ مگر انسان اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ آج انسان ایک لفظ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ کل وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ ساری کائنات دے کر بھی چھوٹ نہ سکے گا۔ کیسا عجیب ہے انسان کا آج، اور کیسا عجیب ہوگا انسان کا کل جس کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔

ایمان ایک دریافت

موجودہ زمانہ میں نظامِ شمسی کے نقشے نہایت مہارت کے ساتھ بنائے گیے ہیں اور وہ کتابوں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر کوئی آرٹسٹ صحیح معنوں میں نظامِ شمسی کا نقشہ نہیں بنا پاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح نقشہ بنانے کے لیے اس کو بہت بڑے کاغذ پر پھیلانا پڑے گا۔ مثلاً زمین کے مقابلہ میں سورج بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ یعنی زمین کو اگر ایک فٹ بال کے برابر دکھایا جائے تو سورج کو بارہ لاکھ فٹ بال کے بقدر بڑھا کر دکھانا پڑے گا۔ یہی معاملہ سورج اور اس کے آخری سیارہ کے فاصلہ کا ہے۔ پھر اتنا بڑا نقشہ کیسے کوئی آرٹسٹ بنا سکتا ہے۔

فرض کیجیے کہ آپ خلا میں ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں سے آپ پورے نظامِ شمسی کو بیک وقت دیکھ سکیں۔ تو آپ کے سامنے ایک عجیب حیرت ناک منظر ہوگا۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک بہت بڑا آگ کا گولہ ہے جو مسلسل بھڑک رہا ہے۔ پھر اس کے چاروں طرف تقریباً ایک درجن غیر منور بہت چھوٹے گولے ہیں جو مسلسل اس کے گرد بیضوی دائرہ میں گھوم رہے ہیں —— اس قسم کے بے شمار مناظر جو کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ ان کے آئینہ میں آدمی ان کے خالق کو دیکھے، آدمی کے اندر معرفت کی وہ روشنی پیدا ہو جس کو شریعت میں ایمان کہا گیا ہے۔

اس طرح مخلوقات کی عظمت میں خالق اپنی عظمت کو دکھا رہا ہے۔ مخلوقات کی حکمت و معنویت میں خالق اپنی بے پایاں حکمت و معنویت کو نمایاں کر رہا ہے۔ مومن وہ ہے جو مخلوقات کے آئینہ میں اس کے خالق کو دیکھ لے۔

ایمان ایک دریافت ہے۔ وہ غیب میں شہود کو پا لینا ہے۔ وہ دیکھے بغیر دیکھ لینا ہے۔ حقیقت سامنے نہ ہوتے ہوئے حقیقت کو اس طرح محسوس کر لینا ہے جیسے وہ بالکل سامنے موجود ہو۔ دریافت ایک ایسا انقلابی تجربہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ وہ پیش آتا ہے وہ اس کی پوری ہستی کو ہلا دیتا ہے۔ وہ ذہن کو نیا رُخ دیتا ہے۔ وہ قلب میں نئی گرمی پیدا کرتا ہے۔

ایک معمولی چیز کی دریافت بھی آدمی کے اندر ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ پھر خدا کی دریافت آدمی کے اندر کتنی بڑی ہلچل پیدا کرے گی، اس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

دل سے دل تک

کسی کا قول ہے کہ بات جب دل سے نکلتی ہے تو وہ دل تک پہونچتی ہے۔ اور جب بات صرف زبان سے نکلتی ہے تو وہ کان سے آگے نہیں بڑھتی (انّ الکلام اذا خرج من القلب دخل القلب واذا خرج من اللسانِ لایُغادر الاّ الآذان)

یہ ایک حقیقت ہے کہ کلام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وقتی طور پر یا مصلحت کے طور پر جو بھی آدمی کے ذہن میں آئے وہ اس کو بولنے لگے۔ یہ زبان سے نکلنے والا کلام ہے۔ یہ بولنے والے کی اوپری سطح سے نکلتا ہے۔ اس لیے وہ سننے والے کی بھی اوپری سطح کو چھوتا ہوا گزر جاتا ہے۔

کلام کی دوسری قسم وہ ہے جو سنجیدہ ذہن سے نکلتی ہے۔ آدمی حقیقی طور پر ایک چیز کو پاتا ہے اور حقیقی احساس کے تحت اس کو بیان کرتا ہے۔ ایسا کلام بولنے والے کے دل کی گہرائی سے نکلتا ہے اس لیے وہ سُننے والے کی دل کی گہرائی تک پہونچ جاتا ہے۔

دل سے نکلنے والا کلام دراصل فطرت سے نکلنے والا کلام ہوتا ہے۔ فطرت مختلف انسانوں کی الگ الگ نہیں ہوتی۔ فطرت تمام انسانوں کی ایک ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا کلام جب کسی انسان سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ سننے والے کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔

گہری فطرت کی سطح پر ہونے والا ہر تجربہ مشترک انسانی تجربہ ہے۔ آپ جب بھی فطرت میں ڈوب کر بولیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ صرف اپنی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی بھی ترجمانی کر رہے ہیں۔ آپ وسیع تر معنوں میں قلوب انسانی کے اندر جھانک کر بول رہے ہیں۔ آپ صرف اپنے نمائندہ نہیں ہیں بلکہ سب کے نمائندہ ہیں۔ ایسا کلام جب کسی بندے کی زبان سے نکلے گا تو ناممکن ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنا اثر نہ ڈالے۔

کوئی شخص خود اپنے احساس کو سنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص فطرت کے ساز پر چھیڑے جانے والے نغمہ کی بازگشت کو اپنے سینے میں محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کوئی شخص خود اپنے آپ سے کیوں کر بے تعلق ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص ایسی آواز کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے جو خود اس کی اپنی آواز ہو۔

انسانی فطرت

ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی پہاڑی چوٹی ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۲۹۰۲۸ فٹ (۸۸۴۸ میٹر) ہے۔ ۳۰ سال کے اندر تقریباً دس مہمیں اس پر چڑھنے میں ناکام ہو چکی تھیں۔ آخر کار ۲۹ مئی ۱۹۵۳ کو دو آدمی ہمالیہ کی اس چوٹی پر پہونچنے میں کامیاب ہو گیے۔ ان میں سے ایک سر ایڈ منڈ ہلیری تھے اور دوسرے تن زِنگ نارگے۔

تن زِنگ نارگے (۱۹۱۴-۱۹۸۶) نیپال کے ایک پہاڑی قلی تھے۔ اس واقعہ کے بعد اچانک ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی۔ دنیا بھر سے ان کو دعوت نامے ملنے شروع ہو گیے۔ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور دوسری عالمی شخصیتوں نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ وہ ہمالین ماؤنٹینرنگ انسٹی ٹیوٹ (دارجیلنگ) کے ڈائرکٹر بنا دیئے گیے۔ تن زِنگ صرف برائے نام انگریزی جانتے تھے مگر ایک مغربی مصنف جیمز ریمزے اولمن (James Ramsey Ullman) نے انگریزی زبان میں ان کی سوانح عمری لکھی جو ایورسٹ کا آدمی (Man of Everest) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (انڈین اکسپریس، نئی دہلی، ۱۰ مئی ۱۹۸۶)

۹ مئی ۱۹۸۶ کو تن زِنگ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد سر ایڈ منڈ ہلیری (ہندستان میں نیوزی لینڈ کے ہائی کمشنر) نے ایک تعزیتی بیان دیا۔ اس بیان میں بتایا گیا تھا کہ تن زِنگ جب ایورسٹ تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیے۔ تو اس وقت اپنی زندگی کے آخری نقطہ پر، وہ برف پر گھٹنوں کے بل جھک گیے، انھوں نے برف میں چھوٹا سا سوراخ بنایا اور اس کے اندر کچھ شیرینی رکھی۔ یہ دیوتاؤں کے لیے ان کا اظہارِ عقیدت تھا:

> And then, at the high-point of his life, Tenzing knelt in the snow, made a little hole and put sweets into it, his gesture to the gods.

انسان عین اپنی فطرت کے زور پر چاہتا ہے کہ وہ اپنی کامیابیوں کو کسی برتر ہستی کے خانہ میں ڈالے۔ مگر خدائے واحد سے آگاہ نہ ہونے کی بنا پر وہ اس کو فرضی دیوتاؤں کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔

اتحاد کا سبق

حضرت آدم کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو مار ڈالا۔ اب قاتل کے سامنے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ وہ مقتول کی لاش کو کیا کرے۔ اس وقت ایک کوّا آیا۔ اس نے زمین کریدی اور ایک مردہ کوّے کو اس کے اندر چھپا کر چلا گیا۔ اس مثال سے قاتل نے دفن کا طریقہ معلوم کیا اور زمین میں گڑھا کھود کر مقتول کو دفن کر دیا (المائدہ ۳۱)

اس طرح گویا انسانیت کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تمہارے گرد و پیش جو دنیا بنائی گئی ہے، اس کی ہر چیز اپنے اندر کوئی نشانی رکھتی ہے۔ دنیا کی چیزوں پر غور کرو اور اس سے اپنی زندگی کے لیے سبق حاصل کرو۔

اس سلسلے کی ایک نشانی چڑیوں کا جھنڈ بنا کر سفر کرنا ہے۔ چنانچہ لمبے سفر کرنے والی چڑیاں مہاجرت کے دوران اجتماعی شکل میں اڑتی ہیں۔ حتی کہ وہ چڑیاں بھی جو دوسرے تمام معاملات میں شدید انفرادیت کا مظاہرہ کرتی ہیں، مثلاً شکار کرنے والی چڑیاں یا کیڑے مکوڑے کھانے والی چڑیاں۔ یکساں عادتوں والی چڑیاں اکثر اوقات باہم مل کر سفر کرتی ہیں۔ یہ مظہر اکثر ساحلی چڑیوں کے اندر پایا گیا ہے۔ جھنڈ کی شکل میں اڑنے والی چڑیاں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ہنس، مرغابی، پیلیکن اور سارس اپنی لمبی پروازوں کے درمیان جن خصوصیات کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان میں سے ایک اہم خصوصیت ان کا انگریزی حرف وی کی شکل بنا کر اڑنا ہے:

> Most birds are gregarious during migration, even those that display a fierce individualism at all other things, such as many birds of prey and insectivorous passerines. Birds with similar habits sometimes travel together, a phenomenon observed among various species of shore-birds. Flocks sometimes show a remarkable cohesion, the most characteristic migratory formation of geese, ducks, pelicans, and cranes is a 'V' with the point turned in the direction of flights (12/181).

"اختلاف کے باوجود اتحاد" ایک ایسی حقیقت ہے جو جانوروں تک کو معلوم ہے۔ مگر اس دنیا میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو اس عالم گیر حقیقت کی خبر نہیں۔

حق کی تلاش میں

مسٹر نٹور سنگھ چین اور پاکستان میں ہندستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ ان کے چینی دوستوں میں سے ایک خاتون بھی ہیں جن کا نام ہین سوئن (Han Suyin) ہے۔ مسٹر نٹور سنگھ نے اس چینی خاتون کا ذکر اپنی ایک کتاب میں کیا ہے جو ۱۹۸۲ میں شائع ہوئی ہے:

K. Natwar Singh, *Curtain Raisers*
Vikas Bhawan, New Delhi, 1983

اس کتاب کے ایک باب میں مذکورہ خاتون ہین سوئن کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے انگریزی میں مسٹر نٹور سنگھ کے نام لکھے تھے۔ ایک خط جس پر ۱۴ جون ۱۹۸۰ کی تاریخ درج ہے، اس میں مسز ہین سوئن لکھتی ہیں کہ میری شدید خواہش ہے کہ آپ سے اسلام کے بارہ میں بہت لمبی گفتگو کروں:

I do intend to have a very long talk with you on Islam.

خط میں یا اصل کتاب میں اس کی مزید تفصیل درج نہیں۔ غالباً ہین سوئن کو کوئی مسلمان نہیں ملا جس سے بات کرکے وہ اسلام کے بارہ میں تفصیلی معلومات حاصل کریں۔ انھوں نے مسٹر نٹور سنگھ کو اس حیثیت سے دیکھا کہ وہ ہندستان کے باشندے ہیں، اور ہندستان وہ ملک ہے جہاں انڈونیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی ہے۔ نیز مسٹر نٹور سنگھ ایک مسلم ملک (پاکستان) میں سفیر رہ چکے ہیں۔ اس بنا پر مسز ہین سوئن نے سمجھا کہ وہ ان کو اسلام کے بارے میں تفصیلی معلومات دے سکیں گے۔

اللہ کے کتنے بندے اور بندیاں سچائی کی تلاش میں ہیں مگر کوئی ان کو سچائی کی بات بتانے والا نہیں۔ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے تو تمام مسلمان اس سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ مگر کارِ نبوت سے عملاً وہ اس طرح غافل ہیں جیسے انھیں انتظار ہو کہ دوبارہ کوئی نبی آئے اور ان کی طرف سے یہ کام کر دے۔ یہ صورتِ حال اس وقت ہے جب کہ مسلمان ساری دنیا میں تقریباً ایک سو کروڑ ہیں۔ ہجوم کے درمیان سناٹا کی اس سے زیادہ عجیب مثال کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

آدمی کی پہچان

تقدم رجل لاداء الشهادة عند عمر رضی الله عنه فقال له ائتنی بمن یعرفك۔ فاتاه برجل فقال له امیر المومنین، هل انت جاره الادنی الذی یعرف مدخله ومخرجه؟ فقال: لا، قال هل كنت رفیقه فی السفر الذی یستدل به علی مكارم الاخلاق؟ قال: لا، قال: هل عاملته بالدینار والدرهم الذی یستبین منه ورع الرجل قال: لا، قال: اظنك رایته قائماً فی المسجد یتلو القرآن، یخفض راسه تارة ویرفعه اخری قال: نعم، فقال امیر المومنین: اذهب فلست تعرفه۔

خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص گواہی دینے کے لیے آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کوئی ایسا آدمی لے آؤ جو تم کو جانتا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک آدمی کو لے آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا۔ کیا تم اس شخص کے قریبی پڑوسی ہو جو اس کے آنے کو اور جانے کو دیکھتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے پوچھا۔ کیا تم اس کے ساتھ سفر میں رہے ہو جس میں آدمی کا اخلاق معلوم ہوتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے پوچھا۔ کیا تم نے اس کے ساتھ دینار اور درہم کا معاملہ کیا ہے جس کے ذریعہ آدمی کا تقویٰ ظاہر ہوتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تم نے اس کو مسجد میں دیکھا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے اور قرآن پڑھ رہا ہے، کبھی وہ اپنا سر نیچے لے جاتا ہے اور کبھی اپنا سر اوپر اٹھاتا ہے۔ آدمی نے کہا کہ ہاں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم واپس جاؤ، کیوں کہ تم اس کو نہیں جانتے۔

مذکورہ آدمی جس شخص کی نیکی کی گواہی دینے آیا تھا، اس کو اس نے "خدا" کے سامنے کھڑا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اس نے اس کو "انسان" کے سامنے کھڑا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ نے اس آدمی کی رائے کو نہیں مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسانی معاملات میں کوئی شخص نیک ثابت نہ ہو اس وقت تک اس کی نیکی کا کوئی اعتبار نہیں۔

یہ اسلام نہیں

ایک انگریزی اخبار (۷ دسمبر ۱۹۸۶) نے ایک کہانی چھاپی۔ اس کا عنوان (نقل کفر کفر نباشد) یہ تھا :

Mohammad the Idiot

یہ عنوان بلاشبہ لغو ہے۔ مگر اس کے جواب میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ بھی یکساں طور پر لغو ہے۔ وہ اس مضمون کو دیکھ کر مشتعل ہو گیے۔ انھوں نے اخبار مذکور کے دفتر پر دھاوا بول دیا اور اس کے گودام کو جلا ڈالا جس میں ایک کرور روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ان مسلمانوں نے اپنے اس عمل کو اسلامی جہاد کا نام دیا ہے۔ مگر یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اس قسم کا ہر فعل مسلمانوں کی قومی اُدھم بازی ہے نہ کہ وہ مقدس عمل جس کو قرآن و حدیث میں جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

مذکورہ اخبار نے جو بے ہودہ گوئی کی وہ اسلامی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو امتحان کی آزادی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات عین اس وقت سے پیش آرہے ہیں جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس دنیا میں موجود تھے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ آپ نے جب عربوں کے سامنے اپنی پیغمبرانہ دعوت پیش کی تو انھوں نے آپ کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ انھوں نے آپ کو عملی طور پر ستانے کے علاوہ آپ پر طرح طرح کے بُرے القاب چسپاں کیے۔ ان میں سے چند القاب نعوذ باللہ یہ تھے :

مُتقوّل	:	بات بنانے والا
ساحر	:	جادوگر
مجنون	:	دیوانہ
کذّاب	:	بہت جھوٹ بولنے والا

مذکورہ مسلمان اگر واقعۃً "اسلامی جہاد" کرنا چاہتے تھے تو ان کا فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن اور حدیث اور سیرت کو دیکھ کر معلوم کرتے کہ اس طرح کی صورت حال جب دور اول میں پیش آئی تو خود رسولؐ اور آپ کے اصحابؓ نے اس معاملہ میں کس قسم کا رد عمل پیش کیا۔ اور پھر وہ وہی کرتے جو رسول اور اصحاب رسول کے نمونہ سے ثابت ہو رہا ہو۔ سیرتِ رسول اور اسوۂ صحابہ سے بے نیاز ہو کر

موجودہ قسم کی اشتعال انگیز کارروائی اپنے نفس کا اتباع ہے نہ کہ خدا و رسول کا اتباع ۔

جب ہم اس اعتبار سے دور اول کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی گستاخی کرنے والے غیر مسلموں کے خلاف کبھی بھی اس طرح کی کارروائی نہیں کی گئی جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے کی یا کر رہے ہیں ۔ ایسے لوگوں کے خلاف صحابہ کرام نے نہ جلوس نکالا ، نہ ان کے گھروں اور جائدادوں کو جلایا ۔ اور نہ ان کے خلاف نعرہ بازی کا ہنگامہ کھڑا کیا ۔ اس کے بجائے جو کچھ کیا گیا وہ صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعائیں کی گئیں ۔ اور دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی تردید کی گئی ۔ اس سے آگے ان کا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دیا گیا ۔

رسول اور اصحاب رسول کا یہ نمونہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیں کیا کرنا ہے ۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہم ایسے لوگوں کے حق میں اصلاح اور ہدایت کی دعا کریں ۔ ان سے ملاقات کر کے پر وقار طریقہ سے ان کی غلط فہمی کو دور کریں ۔ سنجیدہ اور علمی انداز میں وضاحتی مضامین لکھ کر اخبارات میں شائع کرائیں ۔ یہی واحد کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے ۔ اس کے سوا مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے نہ کہ خدا کی رحمت کو کھینچنے والا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو رحمت بنا کر بھیجا ہے نہ کہ جلانے اور پھونکنے والا بنا کر ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے اس مزاج کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے ان سے ایک عظیم نعمت کو چھین لیا ہے ۔ اور وہ داعیانہ کلام کی صلاحیت ہے ۔ داعی اپنی قوم کا ناصح ہوتا ہے ۔ داعیانہ کلام مخاطب کے لیے محبت اور خیر خواہی کے جذبہ سے نکلتا ہے ۔ مگر جب مسلمانوں کا حال یہ ہو کہ وہ بات بات پر بھڑک اٹھیں تو ان کا دل دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور بیزاری کے جذبہ سے بھر جائے گا ۔ ان کے اندر وہ معتدل نفسیات باقی ہی نہ رہے گی جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے سنجیدہ اور مدلل انداز میں خدا کے رسول کا پیغام پیش کر سکے ۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جشنِ رسالت کی دھوم کے باوجود تبلیغ رسالت کا کام بالکل ٹھپ پڑا ہوا ہے ۔ پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ آپ کے خدائی پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہونچائے ۔ مگر پیغام رسالت کو دوسری قوموں تک پہونچانے کے لیے دوسری قوموں کی سچی خیر خواہی درکار ہے ۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے منفی مزاج کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے ہیں ۔

زندگی کا سفر

رالف ناڈر (پیدائش ۱۹۳۴) ایک امریکی قانون داں ہے ۔ اس نے جدید مشینی خطرات پر کئی کتابیں لکھی ہیں ۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے :

Ralph Nader, *Unsafe at Any Speed,* 1965

یہ کتاب ۱۹۶۵ میں چھپی ۔ اس کتاب میں مصنف نے امریکی کاروں کی حفاظتی انجینیرنگ (Safety engineering) سے بحث کی تھی اور بتایا تھا کہ امریکہ کی موجودہ کاریں ہر رفتار کے ساتھ غیر محفوظ ہیں ۔ یہ کتاب شائع ہوئی تو اس نے امریکہ کے لوگوں کو چونکا دیا ۔ حکومت سے لے کر صنعت کار تک سب کے سب اس مسئلہ پر غور کرنے لگے ۔ اس کتاب کے مطالعہ نے لوگوں کو بتایا کہ کار کے سلسلے میں دیکھنے کی چیز صرف یہ نہیں ہے کہ وہ سفر کو کتنا آسان اور مختصر بناتی ہے ۔ بلکہ کار کا ایک اور پہلو بھی حد درجہ قابل لحاظ ہے اور وہ بچاؤ (Safety) کا پہلو ہے ۔

اس کے بعد کار کی صنعت میں ایک نیا انقلاب آیا ۔ آج دنیا بھر میں کاروں کو بنانے والے اپنی کار کی جن خصوصیات کو نمایاں کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ان کا ایک اہم جزء بچاؤ ہونا ہے ۔ کار جب تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی ہو تو مختلف قسم کی غیر متوقع صورت حال پیش آسکتی ہے ۔ اس قسم کی کوئی صورتِ حال کار کے لیے بھی حد درجہ سنگین ہے اور کار کے مسافر کے لیے بھی ۔ ایسی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے کار میں جو انتظامات کیے گیے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ۔ ایک وہ جس کو ایکٹو سیفٹی (Active safety) کہتے ہیں ، یعنی پیشگی حفاظت کا انتظام ۔ دوسرے وہ جس کو پیسیو سیفٹی (Passive safety) کہا جاتا ہے ، یعنی حادثہ ہوجانے کی صورت میں حفاظت ۔

کار کے بارے میں جب یہ نشان دہی کی گئی تو فوراً ہی دنیا بھر کے لوگ اس کے بارے میں سوچنے لگے ۔ کیوں ، صرف اس لیے کہ وہ اس مسئلہ کے بارہ میں سنجیدہ تھے ۔ کار پر بیٹھنے والا ہر آدمی حد درجہ سنجیدگی کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ اس کا سفر حفاظت کے ساتھ مکمل ہو ۔ یہی چیز تھی جس نے تمام لوگوں کو اس معاملہ میں سوچنے پر مجبور کر دیا ۔ مگر آخرت کی خبر سن کر کوئی نہیں چونکتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ سڑک کے سفر کے بارہ میں جس طرح سنجیدہ ہیں اسی طرح وہ آخرت کے سفر کے بارہ میں سنجیدہ نہیں ۔

بھارت کی تعمیر

پروفیسر ہیرن مکرجی ایک فریڈم فائٹر ہیں۔ وہ جواہر لال نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۴) کے زمانہ میں ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ پروفیسر ہیرن مکرجی ایک بار پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی آئے۔ اجلاس سے فارغ ہوکر جب وہ دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان پر ایک تجربہ گزرا۔ کلکتہ واپس پہونچ کر انھوں نے سابق وزیر اعظم ہند، جواہر لال نہرو کے نام ایک خط لکھا جس میں اس تجربہ کا ذکر تھا۔

پروفیسر مکرجی نے لکھا کہ میری ٹرین جب نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے کنارے بہت دور تک جھگی جھوپڑی کی قطاریں چلی جارہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ان جھوپڑیوں میں رہنے والے غریب ہندستانی اگر مجھ سے پوچھیں کہ ملک کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔ جواہر لال نہرو نے اس کے جواب میں پروفیسر مکرجی کو جو خط لکھا اس کا ایک جملہ یہ تھا:

You are paying the price of being sensitive.

(تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو) راقم الحروف کو یہ پسند نہیں کہ ہم حسّاس نہ ہوں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم حساس ہوں تاکہ ہم تڑپیں۔ تاکہ ہم ملک کے حالات کے بارہ میں زیادہ سنجیدہ ہوں، تاکہ ہم اس کے متعلق زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچیں، اور ملک کو بہتر مستقبل کی طرف لے جانے کی فکر کریں۔

آپ جانتے ہیں کہ نئے ہندستان کا آغاز ۱۹۴۷ سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ملک یورپی قوموں کے سیاسی اور اقتصادی استحصال کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی (۱۸۶۹-۱۹۴۸) نے ہندستان کو سیاسی بنیاد (Political base) عطا کی۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۴) نئے ہندستان کے وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے ملک کے لیے صنعتی بنیاد (Industrial base) فراہم کی۔

اس سے پہلے ہندستان کی جو حالت تھی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حکومتی فیصلہ کی قوت

ملکی باشندوں کے ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں کی ترقی کا کام بہت دیر سے شروع ہوسکا ہندستان میں، ریلوے کا آغاز برٹش دور میں ۱۸۵۳ میں ہوا۔ اور بہت جلد سارے ملک میں ریلوے لائن کا جال بچھا دیا گیا۔ مگر سڑکوں کی ترقی ۷۰ سال تک رکی رہی۔ ملک میں سڑکوں کی تعمیر حکومت کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

> Little attention was paid to road development untill the 1920s, mainly because the government had previously focussed its attention on railways (9/295).

۱۹۲۰ کے بعد کے سالوں سے پہلے روڈ کی ترقی پر بہت کم توجہ دی جاسکی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ (برطانی) حکومت نے اس سے پہلے اپنی ساری توجہ ریلوے پر لگا رکھی تھی۔

برطانی حکومت ریل کی پٹریوں کو لوہے کی زنجیریں سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان زنجیروں کے ذریعہ وہ ملک پر اپنے قبضہ کو زیادہ دیر تک باقی رکھ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ریلوے لائنیں بچھانے پر خصوصی توجہ دی۔ مگر سڑکیں بنانے پر وہ توجہ نہ دے سکی۔ ملک کو سیاسی غلامی کی یہ قیمت دینی پڑی کہ سڑکوں کی تعمیر کے معاملہ میں وہ پیچھے ہوگیا جو کہ قومی ترقی کے لیے موجودہ زمانہ میں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔

دوسری مثال صنعت کی ہے۔ ہندستان میں اکثر معدنی ذخیرے (Mineral resources) افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں صنعتی ایندھن (کوئلہ) بھی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کے لوہے (Iron-ore) کے ذخائر کا ½ حصہ صرف ہندستان کی زمین کے نیچے موجود ہے۔ اس کے باوجود ملک کی آزادی سے پہلے اس کی صنعتی ترقی ممکن نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے یہاں ایک بیرونی قوم کا قبضہ تھا۔ وہ ہندستان کو اپنی صنعتی سامانوں کی منڈی بنائے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ میں جب ہندستان آزاد ہوا تو اس کے بعد یہاں باہر کا سامان درآمد کرنے پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اور ملکی صنعت کو ترقی کے مواقع دیئے گئے۔ چنانچہ ہندستان تیزی سے صنعتی میدان میں آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ اب وہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاسی اور صنعتی اعتبار سے ملک اب ترقی کے اگلے اسٹیج پر

پہونچ رہا ہے۔ ہندستان کی سیاسی بنیاد اب اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہ "تیسری دنیا" کے ملکوں کی قیادت کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اسی طرح ہندستان کی صنعتی بنیاد اب اتنی گہری ہو چکی ہے کہ ۱۹۸۵ سے اس نے الکٹرانک دور میں داخلہ کا آغاز کر دیا ہے۔ پہلے ہندستان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ امپورٹ کا راستہ کھولنے سے اس کی اندرونی صنعت برباد ہو جائے گی۔ اور اب ملک کو اس حد تک اعتماد پیدا ہو چکا ہے کہ وہ امپورٹ کی پابندیاں کم کرنے کے بعد بھی یہ اعتماد رکھتا ہے کہ وہ بیرونی صنعتوں کا مقابلہ کرکے آگے بڑھ سکتا ہے۔

یہ باتیں بلاشبہ اچھی ہیں۔ یہ ہر ہندستانی کے لیے خوشی کا باعث ہیں کہ پچھلے ۴۰ سال میں ملک نے سیاسی اور صنعتی بنیاد حاصل کر لی۔ مگر ہندستان کی حقیقی ترقی کے لیے ابھی ایک اور مشکل تر مرحلہ باقی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک کو اخلاقی بنیاد (Moral base) عطا کی جائے۔ اخلاقی بنیاد فراہم کرنے کا مسئلہ فیصلہ کن حد تک اہم ہے۔ اگر یہ بنیاد فراہم نہ ہو تو بقیہ میدانوں کی ترقیاں بھی غیر موثر ہو کر رہ جائیں گی۔

یہاں ہم سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک اقتباس نقل کریں گے۔ انھوں نے اپنے سوانح نگار مائیکل بریچر کو انٹرویو دیتے ہوئے ۱۹۵۶ میں کہا تھا:

> What constitutes a good society? I believe in certain standards. Call them moral standards. They are important in any individual and in any social group. And if they fade away, I think that all the material advancement you may have will lead to nothing worthwhile. How to maintain them, I can't know.
>
> Nehru, *A Political Biography*, By Michael Brecher, p. 607

وہ کیا چیز ہے جو ایک اچھا سماج بناتی ہے۔ میں کچھ متعین معیاروں میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ آپ ان کو اخلاقی معیار کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر شخص اور ہر سماجی گروہ کے لیے اہم ہیں۔ اور اگر وہ باقی نہ رہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ نے جو بھی مادی ترقی حاصل کی ہو وہ بے قیمت ہو کر رہ جائے گی۔ اس اخلاقی معیار کو کس طرح حاصل کیا جائے، اس کا جواب مجھے نہیں معلوم۔

ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم کی ایک تقریر اخبارات میں حسب ذیل الفاظ میں

آئی ہے :

> Prime Minister Rajiv Gandhi today said building factories and dams was useless if the quality of human beings was not good.
> *The Hindustan Times*, September 12, 1986.

وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا کہ کارخانے اور بند بنانا بے فائدہ ہے اگر انسانوں کے اندر اچھی خصوصیات نہ ہوں۔

مثلاً ملک میں بجلی اور زراعت کی ترقی کے لیے ہمیں ایک ڈیم بنانا ہے۔ اب ایک ضرورت یہ ہے کہ ملک آزاد ہو تاکہ وہ کسی خارجی دباؤ کے بغیر خود اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر سکے۔ یہ ضرورت ملک کی سیاسی آزادی سے پوری ہو جائے گی۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی تعمیر کے لیے ضروری ٹکنالوجی موجود ہو۔ یہ ضرورت ہمارے وہ ٹکنکل ماہرین پوری کر دیں گے جو انجینیرنگ کالجوں سے ڈگری لے کر نکل رہے ہیں۔

مگر اچھے ڈیم کی تیاری کے لیے صرف یہی دو چیزیں کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک تیسری چیز بھی ہے جو لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ ہے دیانت داری (Honesty) اگر کام کرنے والے افراد کے اندر دیانت داری کا مادہ نہ ہو تو سیاسی آزادی اور ٹکنکل قابلیت کے باوجود وہ ڈیم تیار نہ ہو سکے گا جو فی الواقع ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

دیانت داری نہ ہونے کی صورت میں یہ ہوگا کہ حکومت عوام سے ٹیکس وصول کر کے ایک ارب روپیہ ٹھیکہ داروں اور انجینیروں اور افسروں کے ہاتھ میں دے گی۔ مگر وہ روپیہ کا ایک حصہ اپنی جیب میں رکھنے کی خاطر یہ کریں گے کہ وہ غیر معیاری لوہا استعمال کریں گے۔ وہ ریت اور سمنٹ کا تناسب غلط کر دیں گے۔ وہ پیسہ بچانے کے لیے ہر چیز میں کمی کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بظاہر ڈیم تو بن کر تیار ہو جائے گا۔ مگر لوہے اور سمنٹ (RCC) کی تعمیر کے باوجود وہ مضبوط نہ ہوگا۔ بے پناہ خرچ اور سالوں کی منصوبہ بندی کے بعد ادھر ڈیم بن کر کھڑا ہوگا اور ادھر خبریں آنے لگیں گی کہ اس کا فلاں حصہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے فلاں حصہ میں شگاف ہو گیا ہے۔ بے پناہ خرچ کے بعد ایک پل بن کر کھڑا ہوگا اور اگلے سال خبر ملے گی کہ وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔

اس مہلک انجام سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک میں جس طرح سیاسی انقلاب اور صنعتی انقلاب برپا کیا گیا ہے، اسی طرح ملک میں ایک اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ ملک کو جس طرح سیاسی بنیاد اور صنعتی بنیاد فراہم کی گئی ہے اسی طرح اس کے لیے اخلاقی بنیاد بھی فراہم کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی بنیاد کیا ہے اور اس کو ہم کس طرح ملک کے حق میں تعمیر کر سکتے ہیں۔

اخلاقیات (یا مارل فلاسفی) پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اب وہ ایک پیچیدہ فن بن گیا ہے مگر اس کی فنی تفصیلات اور اخلاقی فلاسفہ کے اختلافات سے قطع نظر، یہاں میں صرف اس کے سادہ عملی پہلو کو بیان کروں گا۔ جو کہ اخلاق کے معاملہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اخلاق کا خلاصہ انسانیت کا احترام ہے۔ دوسرے افراد یا گرد و پیش کے انسانی معاشرہ کی نسبت سے آدمی کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، خواہ باضابطہ طور پر ان کے بارہ میں قول و قرار ہوا ہو، یا باضابطہ قول و قرار نہ ہوا ہو، ہر حال میں ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اسی ادائیگی کا نام اخلاق ہے۔

اس تعریف کے مطابق اخلاق ہر آدمی کی جانی پہچانی اور معلوم چیز ہے۔ ہر آدمی فطری طور پر حق اور ناحق کی پہچان رکھتا ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اخلاق یہ ہے کہ آدمی اپنی اسی جانی ہوئی چیز پر عمل کرنے لگے۔

اسی بنا پر اخلاقیات کے لیے قرآن و حدیث میں معروف اور منکر کے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ اسلام کی نظر میں پسندیدہ اخلاق "معروف" ہے اور ناپسندیدہ اخلاق "منکر"۔ معروف کے معنی ہیں جانی پہچانی چیز، اور منکر کے معنی ہیں اجنبی چیز۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اچھا قرار دیا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کے اچھا ہونے کا شعور خود انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کو الٰہی شریعت میں برا قرار دیا گیا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشگی طور پر برا سمجھتی ہے۔

تاہم معروف و منکر کے یہ احساسات انسانی فطرت میں وجدانی طور پر پیوست ہیں نہ کہ اس طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح کاغذ کے صفحہ پر کوئی چیز لکھی جاتی ہے۔ الہٰی شریعت یہاں یہ کرتی ہے کہ وہ معروف و منکر کے احساسات کو الفاظ کی شکل دے دیتی ہے۔ وہ محسوس چیز کو ملفوظ چیز بنا دیتی ہے۔

حدیث میں اخلاق کی نہایت سادہ پہچان بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ تم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو سلوک تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دوسروں کو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، بس اسی کو وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ کرنے لگے۔ جس آدمی کے اندر یہ صفت آجائے وہ بااخلاق آدمی ہو گیا۔ اخلاق، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں کہ جو کچھ ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی ہم دوسروں کے لیے بھی پسند کرنے لگیں۔

اخلاق کے اس قدر معلوم اور معروف ہونے کے باوجود اخلاق ہی وہ چیز ہے جو لوگوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کی ایک قیمت ہے اور اسی قیمت نے اس کے خریداروں کو اس سے دور کر رکھا ہے۔ لوگ جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں اس کو کرتے نہیں، کیوں کہ وہ اس کی قیمت دینا نہیں چاہتے۔

اخلاق کی قیمت کیا ہے، ایک لفظ میں اخلاق کی قیمت ہے ـــــــ قیمت نہ ملنے کے باوجود اخلاق برتنا۔ عام آدمی ہمیشہ مفاد کے تحت عمل کرتا ہے۔ یعنی جہاں ایک عمل کرکے کچھ بدلہ ملے وہاں وہ عمل کرے گا اور جہاں عمل کا بدلہ ملنے کی امید نہ ہو وہاں وہ عمل بھی نہیں کرے گا۔ جس سماج میں اس مزاج کے لوگ ہوں وہاں کبھی صحیح معنوں میں اخلاقی ماحول نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ زندگی میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی ایک اچھا سلوک کرے تو فوراً اس کو اپنے اچھے سلوک کا بدلہ مل جائے۔ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو بدلہ کی امید کے بغیر اچھا سلوک کرنا جانیں۔ جو لوگ اپنے عمل کا فوراً بدلہ پانا چاہیں وہ کبھی اعلیٰ کردار کے مالک نہیں بنتے، اور اسی لیے وہ اس دنیا میں کوئی بڑا کام بھی نہیں کر سکتے۔

اخلاقی بنیاد فراہم کرنا دوسرے لفظوں میں اس کا نام ہے کہ لوگوں کو کوئی اتنی بڑی

چیز دی جا سکے جس کے بعد ہر چیز ان کی نظر میں چھوٹی ہو جائے۔ دوسروں کے ساتھ اخلاق برتنے کے لیے آدمی کو کچھ کھونا پڑتا ہے۔ آدمی کو اگر کوئی اتنی بڑی چیز مل جائے کہ اس کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز چھوٹی نظر آئے تو اس کے لیے اخلاق پر قائم رہنا آسان ہو جائے گا۔ آدمی کو اس قابل بنائیے کہ وہ کھونے کو برداشت کر سکے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ با اخلاق ہو جائے گا۔

ایک مغربی ملک کا واقعہ ہے۔ ایک کسٹم افسر نے ایک شخص کو پکڑا جو ایک خلاف قانون چیز ملک کے اندر لے جانا چاہتا تھا۔ آدمی نے کسٹم افسر سے کہا کہ پانچ ہزار ڈالر لے لو اور مجھ کو چھوڑ دو۔ کسٹم افسر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ دس ہزار ڈالر لے لو۔ کسٹم افسر اور زیادہ بگڑ گیا آدمی مزید قیمت بڑھاتا گیا۔ ۲۰ ہزار ڈالر، ۲۵ ہزار ڈالر، ۳۰ ہزار ڈالر، پچاس ہزار ڈالر۔ یہاں تک کہ اس نے کہا کہ ۸۰ ہزار ڈالر لے لو۔ اور چھوڑ دو۔ آدمی نے جب "۸۰ ہزار ڈالر" کہا تو کسٹم افسر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک لمحہ وہ رکا اور اس کے بعد چیخ کر بولا:

ظالمو، تم میری قیمت کے قریب پہونچ گیے ہو

۸۰ ہزار ڈالر کا لفظ سن کر کسٹم افسر کے اندر ایک نیا خیال پیدا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ سالہا سال تک سروس کرنے کے بعد بھی میں ۸۰ ہزار ڈالر بچا نہیں سکوں گا۔ اور یہ شخص مجھے ایک منٹ کے اندر ۸۰ ہزار ڈالر دے رہا ہے۔ پھر میں کیوں نہ اس کو قبول کر لوں۔ پانچ ہزار ڈالر اور دس ہزار ڈالر نے اس کو اندر سے نہیں ہلایا تھا۔ مگر ۸۰ ہزار ڈالر کی پیش کش نے اس کو اندر سے ہلا دیا۔ اس کے اندر جو اخلاقی بنیاد موجود تھی وہ متزلزل ہو کر رہ گئی۔

یہی ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی کی قیمت کہیں نہ کہیں لگ جاتی ہے۔ اور جہاں آدمی کی قیمت لگ جائے۔ بس وہیں اس کے اندر اخلاقی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اصول کے بجائے مفاد کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو سماجی پوزیشن کی خاطر با اخلاق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عام رویہ اور روزمرہ کی ملاقات میں بظاہر اچھے بنے رہتے ہیں تاکہ لوگ انھیں اچھا سمجھیں، مگر یہ اخلاق کے لیے بہت کمزور بنیاد ہے۔ ایسے لوگوں کا اخلاق نہایت وقتی اخلاق ہوتا ہے۔ جیسے ہی کوئی

ذاتی انٹرسٹ کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ ان کی حد آجاتی ہے۔ وہ ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی خاطر اخلاقی اصول کو بھول جاتے ہیں۔

ایک شخص سرکاری دفتر میں کلیدی عہدہ (Key post) پر تھا۔ اس کے یہاں ایک صاحب کی فائل تھی۔ ان کا کیس بالکل جائز کیس تھا مگر وہ ان کو پریشان کر رہا تھا تاکہ وہ اس کو ایک بڑی رقم رشوت میں دیں۔ یہ صاحب اپنے جاننے والے ایک شخص سے ملے جن کے متعلق ان کو پتہ تھا کہ وہ مذکورہ سرکاری ملازم کے دوست ہیں۔ ان سے اپنی مصیبت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ بہت اچھا میں اس سے ملوں گا۔

یہ صاحب ایک روز مذکورہ سرکاری ملازم کے یہاں گیے۔ ملازم خندہ پیشانی سے ملا۔ اس نے چائے اور سگریٹ پیش کیا۔ مگر جب آنے والے نے اس سے اپنی ضرورت بیان کی تو فوراً اس کا چہرہ بدل گیا۔ طرح طرح کی قانونی موشگافیاں بتا کر اس نے عذر کر دیا۔ وہ مذکورہ شخص کو جان بوجھ کر صرف اس لیے پریشان کر رہا تھا کہ وہ اس کو ایک بڑی رقم رشوت کے طور پر دے۔ ایسی حالت میں رقم لیے بغیر وہ فائل کیسے واپس کر دیتا۔

مذکورہ سرکاری افسر ابتداءً با اخلاق تھا۔ مگر جب فائل کا مسئلہ طے کرنے کی بات آئی تو اس کے اخلاق کی حد آگئی۔ وہ صرف اس وقت تک با اخلاق تھا جب تک اس کے ذاتی مفاد پر زد نہ پڑ رہی ہو۔ جب ذاتی مفاد خطرے میں آجائے تو پھر اس کے نزدیک اخلاق کی کوئی قیمت نہ تھی۔

مغربی ملکوں میں بظاہر اس قسم کی بد اخلاقی نہیں ہے۔ وہاں دفتروں میں بغیر رشوت کے کام ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام دیتے ہیں۔ پولیس کا آدمی کسی کو ناجائز کام کرتے ہوئے پکڑے تو اس آدمی کو معلوم ہے کہ وہ پولس والوں کی جیب میں نوٹ ڈال کر ان کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ روزمرہ کی زندگی میں جو بدعنوانیاں (Corruption) ہمارے ملک میں نظر آتی ہیں وہ مغربی ملکوں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتیں۔

تاہم یہ اخلاق قومی مفاد کی بنیاد پر بنا ہے اس لیے اس کی بھی حد آجاتی ہے۔

مثلاً مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا کہ دودھ میں پانی ملایا جائے۔ نقلی سامان تیار کرکے بازار بھر دیئے جائیں۔ ایک تاجر نمونہ کے طور پر اچھا مال دکھائے اور اس کے بعد خراب مال پیک کرکے آپ کو بھیج دے۔ دفتروں میں اپنا جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہ ہو سکے۔

مگر مغربی انسان کے اس اخلاق کی اس وقت حد آجاتی ہے جب کہ اس کا اخلاق قومی مفاد سے ٹکرانے لگے۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک کے یہاں سب سے زیادہ جس صنعت کو ترقی ہوئی ہے وہ جنگی صنعت ہے۔ ان ملکوں کے پاس تیار شدہ جنگی سامان کے انبار جمع ہو گیے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں انتہائی مہلک ہیں۔ وہ خدا کی دنیا کو جہنم بنا دینے والی ہیں۔ مگر ان کا قومی مفاد چاہتا ہے کہ وہ فروخت ہوں تاکہ ان پر جو بے پناہ لاگت آئی ہے وہ نفع کے ساتھ انھیں واپس ملے۔

اگر حالات بالکل معمول پر ہوں۔ ہر طرف امن وسکون ہو تو کوئی بھی ان کے مہلک ہتھیاروں کو نہیں خریدے گا۔ اس لیے یہ ترقی یافتہ قومیں یہ کرتی ہیں کہ عالمی سطح پر تناؤ کے حالات پیدا کرتی ہیں۔ ان کے رہنما اپنے تخریبی منصوبوں کے ذریعہ ایک ملک کو دوسرے ملک سے لڑاتے ہیں۔ وہ ہر علاقہ میں زبردستی ایک "اسرائیل" کھڑا کرتے ہیں تاکہ قوموں کے اندر خطرہ کی نفسیات پیدا ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ ان کے ہتھیار خریدیں۔

اپنے معاشرہ میں ذاتی سلوک کے معاملہ میں ان قوموں کے افراد با اخلاق ہیں۔ مگر جب ان کی قوم کے مفاد کا معاملہ آجائے تو وہاں ان کی حد آجاتی ہے۔ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ ان سب چیزوں کو جائز کر لیتے ہیں جن کو وہ ذاتی مفاد کے معاملہ میں ناجائز کیے ہوئے تھے۔

ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اس کے لیے سب سے بڑی (Supreme) حیثیت رکھتی ہے۔ عام آدمی کے لیے اس کا ذاتی مفاد اس کے لیے سپریم ہوتا ہے۔ کچھ ترقی یافتہ معاشروں میں ان کا قومی مفاد ان کے لیے سپریم ہے۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز اخلاق کی صحیح بنیاد نہیں۔ کیوں کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر بننے والے اخلاق کی اس وقت

حد آجائے گی جب کہ اس کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکرا رہا ہو۔ اسی طرح قومی مفاد کی بنیاد پر بننے والے اخلاق کی اس وقت حد آجاتی ہے جب کہ اپنی قوم کا مفاد اور دوسری قوم کا مفاد یکساں نہ رہے۔ اپنا قومی مفاد اگر اس میں ہو کہ لوگ جنگی سامان خرید کر قتل و غارت کا میدان گرم کریں تو وہ جنگی سامان بنائے گا اور اس کو دوسری قوموں کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ خواہ اس کی قومی تجارت کا فروغ دوسری قوموں کی ہلاکت کی قیمت پر کیوں نہ ہو رہا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی ایک ہی صحیح بنیاد ہے اور وہ خدائے برتر کا عقیدہ ہے جو تمام کائنات کا خالق و مالک ہے۔ خدا تمام دوسری چیزوں سے بڑا ہے۔ وہ سب سے زیادہ سپریم ہے۔ جو شخص خدا کو پالے اس نے سب سے بڑی چیز کو پالیا۔ ایسے آدمی کی کبھی حد نہیں آئے گی۔ اس کی نظر میں ہر دوسری چیز چھوٹی ہو گی۔ خدا کو پاکر وہ آخری سب سے بڑی چیز کو پالے گا۔ اس کے بعد ہر دوسری چیز کی قربانی اس کے لیے آسان ہو جائے گی۔ وہ ہر دوسری چیز کا کھونا برداشت کر لے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہو گا کہ کھونے کے بعد بھی اس کے پاس ایک چیز موجود ہے جو تمام چیزوں سے زیادہ بڑی ہے اور وہ اس کا خدا ہے۔

ایک ملحد کا اعتراف

برٹرینڈ رسل خدا کو نہیں مانتا۔ وہ انسانی معاملات کی تنظیم کے لیے انسانی قانون کو کافی سمجھتا ہے۔ مگر اسے یقین نہیں کہ ایسا ممکن ہے۔ وہ اس وقت اپنے کو لاجواب محسوس کرتا ہے کہ جب کہ ایک خدا پرست آدمی اس سے کہے کہ میں انسانی حاکم کی پکڑ سے بچ سکتا ہوں، مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے آپ کو خدائی حاکم کی سزا سے بچالوں:

> I might escape the human magistrate, but I could not escape punishment at the hands of the Divine Magistrate.

برٹرینڈ رسل نے جان لاک (۱۶۳۲ — ۱۷۰۴) کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہبی عقیدہ کے مطابق خدا نے کچھ خاص اخلاقی قوانین مقرر کیے ہیں۔ جو لوگ ان

قوانین کی پیروی کریں وہ جنّت میں جائیں گے اور جو لوگ ان قوانین کو توڑیں وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اپنے لیے یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ انھیں جہنّم میں ڈال دیا جائے۔ محتاط قسم کے خوشی کے متلاشی لوگ اس بنا پر نیک اور با اخلاق بن جائیں گے۔ گناہ آدمی کو جہنم میں لے جائے گا، اس عقیدہ میں زوال آنے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ یہ بات مزید مشکل ہو گئی ہے کہ نیک زندگی اختیار کرنے کے حق میں ایسی دلیل لائی جائے جس کا آدمی خود لحاظ کر سکے۔ بنتھم جو کہ ایک آزاد خیال مفکر تھا، اس نے انسانی قانون ساز کو وہ جگہ دی جو مذہبی عقیدہ کے مطابق خدا کی جگہ تھی۔ اس کے نزدیک یہ قوانین اور سماجی حالات کا کام تھا کہ وہ فرد اور عوام کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کریں، تاکہ ہر شخص اپنی ذاتی خوشی تلاش کرتے ہوئے اجتماعی خوشی کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو۔ مگر یہ اس سے کم اطمینان بخش ہے جتنا کہ جنّت اور دوزخ کے عقیدہ کے تحت ذاتی مفادات اور عوامی مفادات میں ہم آہنگی کا پیدا ہونا، اس لیے بھی کہ انسانی قانون ساز ہمیشہ دانش مند یا نیک نہیں ہوتا، اور اس لیے بھی کہ انسانی حکومتیں ہمہ بیں اور ہمہ داں نہیں ہیں:

> God has laid down certain moral rules; those who follow them go to heaven, and those who break them risk going to hell. The prudent pleasure-seeker will therefore be virtuous. With the decay of the belief that sin leads to hell, it has become more difficult to make a purely self-regarding argument in favour of a virtuous life. Bentham, who was a free-thinker, substituted the human lawgiver in place of God: it was the business of laws and social institutions to make a harmony between public and private interests, so that each man, in pursuing his own happiness, should be compelled to minister to the general happiness. But this is less satisfactory than the reconciliation of public and private interests effected by means of heaven and hell, both because lawgivers are not always wise and virtuous, and because human governments are not omniscient.

Bertrand Russell, *A History Of Western Philosophy*, pp. 592-93.

ایمان پر قائم رہنا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم کو جنت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ (حم السجدہ ۳۰)

اس کی تفسیر کے تحت دو اقتباس یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

عن سفیان بن عبد اللہ الثقفی قال، قلت یارسول اللہ قل لی فی الاسلام قولاً لا اَسئَلُ عنہ احداً بعدک۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم: قل اٰمنتُ باللہ ثم استقم

(تفسیر ابن کثیر، جلد ثالث،)

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے اسلام کے بارہ میں ایسی بات بتائیے کہ اس کے بارہ میں آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ثابت قدم رہو۔

قال الحافظ ابو یعلیٰ الموصلی عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال: قرأ علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھٰذہ الآیۃ (اِنَّ الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا) فقال قد قالھا ناس ثم کفر اکثرھم فمن قالھا حتی یموت فقد استقام علیھا۔

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے یہ آیت پڑھی (جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے) آپ نے فرمایا کہ لوگوں نے یہ کلمہ کہا۔ پھر ان میں سے اکثر اس کے منکر بن گیے۔ جس شخص نے اس کو موت تک کہا تو وہ اس پر قائم رہا۔

ایمان لانا اس بات کا عہد کرنا ہے کہ آدمی دنیا میں خدا دالا بن کر رہے گا۔ وہ اپنے ہر معاملہ میں وہی کرے گا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور وہ نہ کرے گا جو خدا کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ مومن وہ ہے جو یہ عہد کرکے زندگی میں داخل ہو اور پھر ہر معاملہ میں اس عہد پر قائم رہے خواہ وہ اس کی خواہش کے مطابق ہو یا اس کی خواہش کے خلاف۔ منافق وہ ہے جس نے زبان سے یہ عہد کیا مگر جب اس عہد پر عمل کرنے کا وقت آیا تو وہ پھر گیا۔ وہ خدا کو بھول کر اپنے نفس کے پیچھے چل پڑا۔

تین قسم کے آدمی

آدمی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے درجات ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا۔ کوئی کامیاب اور کوئی ناکام۔

ایک انسان وہ ہے کہ جو کچھ وہ کرے اس کو کرنے کے بعد بھول جائے۔ ایک کام کرنے کے بعد اس کی نظر دوسرے کام پر جم جائے۔ اس کی نظر اپنے کیے پر نہ ہو، بلکہ اس پر ہو جو اس نے نہیں کیا۔ وہ اپنے "ہے" کو بھلا دے اور اپنے "نہیں" کو یاد رکھے۔ یہ اول درجہ کا انسان ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کی ترقی برابر جاری رہتی ہے، اس کی ترقی کسی حد پر نہیں رکتی۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو اپنا بے لاگ جائزہ لیتا رہے۔ وہ اپنے کیے کو بھلا نہ سکے تاہم وہ اپنے بارہ میں غلط فہمی کا شکار بھی نہ ہو۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی سمجھے جتنا کہ فی الواقع وہ ہے، نہ کہ اس سے زیادہ۔ مثلاً اگر اس نے ایک جزئی کام کیا ہے تو وہ اپنے آپ کو جزئی کام کرنے والا قرار دے نہ کہ کلّی کام کرنے والا۔ اس کا ذہن یہ ہو کہ میں نے ایک حیثیت سے دین کی خدمت کی ہے نہ کہ ساری حیثیت سے۔

یہ دوسرا آدمی بھی ایک صحیح آدمی ہے۔ وہ خواہ زیادہ بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکے، مگر انشاء اللہ وہ تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رہے گا۔

تیسرا شخص وہ ہے جو حد سے تجاوز کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ ظاہر کرے جتنا کہ وہ فی الواقع ہے۔ اس سے اگر کوئی نیک کام ہو جائے تو وہ ہمیشہ اس کا چرچا کرتا رہے۔ وہ جزء پر عامل ہو اور کُل کا کریڈٹ لینا چاہے۔ اس نے کسی ایک حیثیت سے کوئی اچھا کام کیا ہو اور یہ یقین کرے کہ جو کچھ ہوا ہے سب اسی کی بدولت ہوا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔

یہ تیسرا شخص وہی ہے جس کو شریعت میں ریاکار کہا گیا ہے۔ ایسا شخص آخری حد تک بھٹکا ہوا ہے۔ وہ خدا کے غضب کا مستحق ہے نہ کہ خدا کی رحمت کا۔ خدا کی دنیا میں اس کے لیے ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ اور مقدر نہیں۔

اختلاف نہیں

عن ابن مسعودٍ قال : سمعتُ رجلاً قرأَ وسمعتُ النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم یقرأُ خلافَها ۔ فجئتُ به النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم فاخبرتُه ۔ فعرفتُ فی وجهه الکراهیةَ فقال : کلاکما محسن ۔ فلا تختلِفوا ۔ فانَّ من کان قبلکم اختلفُوا فهلکو ۔ (رواه البخاری)

مشکوٰۃ المصابیح ، الجزء الاول ، صفحہ ۶۷۷

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو سنا ۔ وہ قرآن پڑھ رہا تھا ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے اس کے خلاف پڑھتے ہوئے سنا تھا ۔ میں اس آدمی کو لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو خبر دی ۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہو گیے ہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ تم دونوں ٹھیک پڑھ رہے ہو ۔ پس تم لوگ اختلاف نہ کرو ۔ کیوں کہ تم سے پہلے کی امتوں نے اختلاف کیا اور پھر وہ ہلاک ہو گئیں ۔

قرآن کو پڑھنے کے معاملہ میں یہ اختلاف کس قسم کا تھا ، اس کو سمجھنے کے لیے بطور مثال اس اختلاف کو دیکھا جا سکتا ہے جو موجودہ زمانہ میں سورہ فاتحہ میں " الضآلین " کی قرأت کے بارہ میں برپا ہے ۔ اس قسم کے اختلاف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلاکت کا سبب قرار دیا ۔

لفظی فرق یا جزئی اختلاف پر جھگڑنا سراسر بے دینی ہے ، خواہ وہ دین کے نام پر کی جا رہی ہو ۔ جب کسی قوم میں روح دین ختم ہو جاتی ہے تو اس کے اندر الفاظ اور جزئیات والے اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں ۔ یہ ایک بے حد تشویشناک علامت ہے ۔ اس قسم کی چیزوں پر ہنگامے قوم کی زندگی کا ثبوت نہیں ہیں بلکہ وہ اس کی موت کا اعلان ہیں ۔ اس سے بڑا نادان اور کوئی نہیں جو اس قسم کے اختلافی ہنگاموں کو قوم کی زندگی کی علامت سمجھ لے ۔

جزئی اور غیر بنیادی امور میں اختلاف کو برداشت کرنا ہی اتحاد کا واحد ذریعہ ہے ۔

ایک سفر

بنگلور جنوبی ہند میں واقع ہے اور وہ ہندستان کا چھٹا سب سے بڑا شہر ہے۔ وہ ۱۸۳۰ سے کرناٹک کا انتظامی مرکز ہے۔ یہاں کا موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے۔ شہر کی آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ ہے جس میں دس فی صد سے کچھ کم مسلمان ہیں۔

بنگلور کے لیے میرا پہلا سفر غالباً ۱۹۵۰ میں ہوا تھا۔ اس وقت میں اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں صاحب کے کارخانہ لائٹ اینڈ کمپنی لیمٹڈ (قائم شدہ ۱۹۴۴) سے وابستہ تھا۔ اور کارخانہ کی ضرورت کے تحت اعظم گڈھ سے بنگلور گیا تھا۔ بنگلور میں میرا قیام "باسط سرائے" میں تھا۔ یہ ایک نہایت صاف ستھرا مسافر خانہ تھا جو رعایتی کرایوں پر مسافروں کو ٹھہرنے کے لیے کمرہ دیا کرتا تھا۔

اس سفر کا ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میرا ایک مزاج یہ ہے کہ میں ہر بات کو خود جاننا چاہتا ہوں۔ کسی بات کو میں اسی وقت مانتا ہوں جب کہ وہ میری ذاتی دریافت بن چکی ہو۔ اپنے اس مزاج کی وجہ سے میں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور بہت زیادہ مصیبتیں برداشت کی ہیں۔

اس لمبے سفر کے دوران میرے اندر ایک ایسا تجربہ کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کو میں اپنے گھر پر رہ کر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ کہ میں اس بات کا اندازہ کروں کہ میں زیادہ سے زیادہ کتنی دیر تک بھوکا رہ سکتا ہوں۔ چنانچہ سفر کی حالت میں میں نے اس پر عمل شروع کیا۔ ٹرین اسٹیشنوں پر رکتی۔ لوگ پلیٹ فارم پر اتر کر کھاتے پیتے۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ انھیں دیکھتا مگر خود کچھ نہ کھاتا۔ واضح ہو کہ میرا یہ فاقہ سراسر اختیاری تھا۔ کیوں کہ اس وقت بھی میری جیب میں کافی روپیہ موجود تھا۔

ایک وقت گزرا، دوسرا وقت گزرا، تیسرا وقت گزرا۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک کئی وقت گزرتے رہے۔ اور میں نے کھانے کی قسم کی کوئی چیز اپنے منہ میں نہ ڈالی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب کہ مجھے بے حد کمزوری محسوس ہونے لگی۔ ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ پلیٹ فارم

پر اترا۔ کچھ لوگ ریلوے اسٹیشن کے کینٹین کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی اس طرف چل پڑا۔ اور کینٹین کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کا صحیح علم مجھے اس وقت ہوا جب کہ میں بنگلور پہونچ چکا تھا۔

بنگلور میں میں کسی سڑک پر چل رہا تھا کہ اچانک ایک شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے لیے ایک اجنبی شخص تھا۔ اس نے میری حیرت کو دور کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا تھا جب کہ آپ فلاں ریلوے اسٹیشن کے کینٹین میں تھے۔ میں بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہا تھا اور اس وقت اس کینٹین میں موجود تھا۔ اس نے کہا کہ آپ جب کینٹین کے اندر داخل ہوئے تو آپ ڈگمگا رہے تھے۔ اور بھری ہوئی کرسیوں پر لوگوں کے اوپر بیٹھ رہے تھے۔ آخر کار ایک شخص نے آپ کو پکڑ کر ایک خالی کرسی پر بٹھایا۔ اس کے بعد آپ کی میز پر کھانا رکھا گیا تو آپ نے کچھ کھایا اور کچھ چھوڑا اور پھر کوئی بڑا نوٹ دے کر واپس جانے لگے۔ اس وقت کینٹین والے نے روک کر آپ کو بقیہ پیسے ادا کیے۔

یہ قصہ بتانے کے بعد مذکورہ آدمی مسکرایا۔ اس نے کہا کہ "ہم لوگ اس وقت یہ سمجھے کہ آپ پیے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ سے اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔" میں نے اس آدمی سے کچھ نہیں کہا مگر میں جانتا تھا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ مسلسل فاقہ کی وجہ سے مجھے چکر آگیا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بنگلور کے لیے میرا دوسرا سفر فروری ۱۹۷۰ میں ہوا۔ اس وقت مجھے "دینی تعلیمی سمینار" میں صدر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ اس موقع پر بنگلور میں میری کئی تقریریں ہوئی تھیں۔ اس سفر کی تفصیلی روداد اسی زمانہ میں ہفت روزہ (الجمعیۃ دہلی) ۸ مارچ، ۲۰ مارچ، ۲۷ مارچ ۱۹۷۰ میں شائع ہوئی تھی۔ ایک تقریر میں میں نے کہا تھا:

> جنوبی ہند کا علاقہ ابھی تک اس فرقہ وارانہ تشدد سے محفوظ ہے جو شمالی ہند کے علاقہ میں عام طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ قدرت نے جنوبی ہند کے رہنے والوں کے لیے ایک امکان مقدر کیا تھا جس کو انھوں نے اب تک استعمال نہیں کیا۔ مجھے ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ جس طرح ۱۹۴۷ سے پہلے آزادی کی لڑائی میں قائدانہ رول شمالی ہند کے لیے مقدر تھا اسی طرح ۱۹۴۷ کے بعد ملک کی نئی تعمیر کے سلسلہ میں قائدانہ رول جنوبی ہند والوں کے لیے مقدر ہے۔ کیوں کہ اپنے حقیقت پسندانہ مزاج اور غیر اختلافی روایات کی بنا پر وہی اس طرح کے تعمیری کام کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ جس طرح اس علاقہ کے غیر مسلم اپنی مخصوص حیثیت کا شعور نہیں رکھتے اسی طرح اس علاقہ کے مسلمان بھی اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں آپ کو جو مواقع حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر آپ پورے ملک کے لیے روشنی کا مینار بن سکتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں کو وہ چیز حاصل ہے جس سے شمالی ہند کے مسلمان اپنے کو محروم محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ احساس تحفظ (Sense of security) ہے۔ یہ چیز جو یہاں آپ کو حاصل ہے اس کو جانیے اور اس کو استعمال کیجئے۔ اس طرح آپ پورے ملک کے مسلمانوں کو نیا حوصلہ دینے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ (الجمعیۃ ویکلی ۶ مارچ ۱۹۷۰)

بنگلور کے لیے میرا تیسرا سفر ستمبر ۱۹۸۳ میں ہوا۔ یہ سفر حلقۃ الرسالہ کی دعوت پر تھا۔ اس سفر کی رپورٹ ماہنامہ الرسالہ مارچ ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکی ہے۔

میرا چوتھا سفر عالمی مذہبی کونسل (Council for the World's Religions) کی دعوت پر ہوا۔ یہ مختلف مذاہب کی ایک بین اقوامی کونسل ہے جس کا صدر دفتر نیویارک (امریکہ) میں ہے۔ اس کے تحت بنگلور میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع بحث یہ تھا:

Religious Harmony: Problems and Possibilities

اس کانفرنس کے موقع پر مجھے مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی، اسی سلسلہ میں میرا یہ سفر ہوا۔ کانفرنس کے موقع پر میں نے جو مقالہ (انگریزی) پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا داعی کی اخلاقیات:

Missionary Ethics

یہ مقالہ انشاءاللہ الرسالہ انگریزی میں شایع کر دیا جائے گا۔

۲۶ جون ۱۹۸۶ کو انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۰۳ کے ذریعہ دہلی سے بنگلور کے لیے روانہ ہوا۔ ابتدائی مراحل سے گزر کر جہاز کے سامنے پہونچا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا ٹینکر جہاز کے پاس کھڑا ہوا ہے اور مشین کے ذریعہ پٹرول کا ذخیرہ جہاز کی ٹنکی میں پمپ کر رہا ہے۔ جیسے ہی جہاز کا ایندھن ختم ہوا، ایرپورٹ کا انتظام فوراً اس کی مدد کے لیے آپہونچا۔

یہ منظر دیکھ کر دل بھر آیا۔ بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گیے۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں قبل از وقت بوڑھا ہو گیا۔ میری طاقت ختم ہو گئی۔ تو میری مدد کے لیے آجا۔ میرے اندر دوبارہ طاقت کا خزانہ بھر دے۔ تاکہ میں تیرے دین کی خدمت کر سکوں۔

میں انھیں جذبات میں گم تھا کہ ڈاکٹر اوصاف علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اسی جہاز سے بنگلور جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک فرانسیسی مصنف کا قصہ بتایا جو تقریباً مفلوج ہے۔ مگر اسی حالت میں اس نے تین اعلیٰ کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ ڈاکٹر اوصاف علی صاحب کی ملاقات اس فرانسیسی مصنف سے ہوئی تو اس نے کہا کہ جب میں لکھنے کی میز پر بیٹھتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ۳۵ سال کا ایک جوان ہوں۔ یہ واقعہ بتا کر ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوت ارادی (Will power) کے ذریعہ کام کرتا ہے نہ کہ قوت جسمانی کے ذریعہ۔

۳۴ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا ہمارا جہاز ڈھائی بجے دن میں بنگلور پہونچا۔ کانفرنس کے منتظمین نے قیام کا انتظام ویسٹ اینڈ ہوٹل (West End Hotel) میں کیا تھا۔ میرے کمرہ کا نمبر ۱۴۱۹ تھا۔ یہاں میں ۲۶ جون سے ۳۰ جون ۱۹۸۶ تک مقیم رہا۔

بنگلور اپنی سرسبزی اور معتدل آب و ہوا کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ مگر صنعتوں کی کثرت نے پچھلے برسوں سے یہاں دو مسئلے پیدا کر دیئے ہیں۔ پانی کی کمی اور بجلی کی کمی۔ اس دنیا میں ہر ترقی کے ساتھ ایک غیر ترقی لگی ہوئی ہے۔ یہ دونوں کچھ اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کو ہیولاک ایلیس (Havelock Ellis) نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

What we call progress is the exchange of
one nuisance for another.

جس چیز کو ہم ترقی کہتے ہیں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک ناخوش گواری کا دوسری ناخوش گواری سے تبادلہ ہے۔

ہوٹل کے ایک بند کمرے سے مسلسل شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ تالیاں بجانا، زور زور سے چلانا، باہر تک سنائی دے رہا تھا۔ یہ ایک عجیب وغریب تجربہ تھا۔ ابتداءً میں سمجھا کہ کچھ لوگ شراب پی کر مدہوش ہیں اور مدہوشی میں چیخ پکار کر رہے ہیں۔ جب بہت دیر تک سلسلہ جاری رہا تو میں نے ہوٹل کے ایک کارکن سے پوچھا کہ اس کمرہ میں اتنا زیادہ شور کیوں ہو رہا ہے۔ وہ میرے سوال پر مسکرایا اور پھر بولا: یہاں سیاست والوں (Politicians) کو ٹریننگ دی جارہی ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہندستان پروفشنل سیاست والوں سے بھر گیا ہے۔

یہاں ایک صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر اسماعیل فاروقی کو قتل کر دیا گیا۔ وہ امریکہ (فلاڈلفیا) میں رہتے تھے اور نہایت قابل آدمی تھے۔ تاہم وہ فلسطینی تھے اور فلسطین کے مسئلہ پر آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے۔ مئی ۱۹۸۶ میں ایک روز اچانک دو آدمی ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں آرا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر اسماعیل اور ان کی امریکی بیوی کی گردن پر آرے چلا کر انھیں ذبح کر ڈالا اور بھاگ گیے۔ اغلب ہے کہ یہ یہودیوں کی کارروائی تھی۔ انھوں نے پروفشنل مجرموں کے ذریعہ انھیں قتل کروادیا۔ ڈاکٹر اسماعیل فاروقی سے میری ملاقات کوالالمپور میں جولائی ۱۹۸۴ میں ہوئی تھی۔

آج کل کی دنیا میں سیاست سے لے کر مجرمانہ قتل تک ہر چیز پروفیشن (پیشہ) بن گئی ہے۔ پیشہ ور لوگ سیاست چلاتے ہیں اور پیشہ ور لوگ ہی جرائم کرتے ہیں۔

بنگلور کا یہ اجتماع کوئی عوامی نوعیت کا اجتماع نہیں تھا۔ یہ دراصل "دکاترہ" کی ایک کانفرنس تھی۔ مختلف مذاہب کی منتخب شخصیتیں دو درجن کی تعداد میں جمع ہوئیں۔ ان کا تعلق عیسائیت، ہندو ازم، بدھزم، جین ازم، سکھ ازم، پارسیت اور اسلام سے تھا۔ ہر آدمی نے متعین موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا۔

COUNCIL FOR THE WORLD'S RELIGIONS
1986
Participant Address List

Dr M.Wahiduddin Khan
The Islamic Centre
C-29Nizamuddin West
New Delhi, 110 013
India
Office:.611128

Dr. N. B. Mahadevappa
Department of Philosophy
Karnatak University
Dharward, 580 003
Karnataka
India

Dr. A. Ramamurthy
17, Andrew's Pali
Santiniketan, 731 235
West Bengal
India

Dr K.L. Seshagiri Rao (Convener)
1907 Swanson Drive
Charlottesville, VA 22901
Home: (804) 924-6720

Dr.Indira Rothermund
Center for Development Studies And Activities
994/4 Hanuman Mandir Path
Poona, 411 016
India
Home: 52309
Office: 51826

Professor Shahab Sarmadee
Center of Advanced Study,Department of History
Aligarh Muslim University
Aligarh, U.P. 202 001
India
Home: 6756
Office: 5546

Dr Avtar Singh
Head Department of Philosophy
Punjabi University
Patiala, Punjab 147 002
India
Office: 73261 ext. 86

Dr Wazir Singh
Head Dept.of Religious Studies
Punjabi University
Guru Gobind Singh Bhavan
Patiala, Punjab 147 002
India
Office : 73261/88

Dr Syed Ausat Ali
Indian Institute of Islamic Studies
Panchkuin Road
New Delhi, 110 001
India
Home: 643-3561
Office: 643-9685

Reverend Dr Anand Spencer
Department of Religious Studies
Punjabi University
Guru Gobind Singh Bhavan
Patiala, Punjab 147 002
India

Professor G.S. Talib
80-B Model Town
Patiala, Punjab
India
Home: 77297

Dr S.G. Tulpule
952 Sadashiv Peth
Poona, 411 030
Maharashtra
India
Home: 443014

Professor R.I. Umarani
D-4 Pavatenagar
Karnatak University
Dharwad, 580 003
Karnataka
India

Dr Rajendra D Verma
Al/21 Azad Apartments
Shri Aurbind Marg
New Delhi, 110 016
India
Office: 669077

Dr M Darrol Bryant
5 Park Avenue West
Elmira, Ontario N3B 1K9
Canada
Home: (519) 669-5321
Office: (519) 884-4400

Dr Antony K Chirappanath
Department of Gandhian Studies
and Peace Research
Karnatak University
Dharwad, Karnataka 580 003
India
Office: (9) 8194 ext 41

۲۶ جون کی شام کو پہلی نشست ہوئی۔ اس نشست میں تعارف وغیرہ ہوا۔ باری باری ہر ایک شخص نے اپنا تعارف اور اپنے تجربات پیش کیے۔ اظہار خیال کی زبان صرف انگریزی تھی۔ متنوع تجربات نے اس مجلس کو کافی دل چسپ بنا دیا۔

ڈاکٹر راجندر ورما نے بتایا کہ میں ایک مذہبی ہندو گھرانے میں پیدا ہوا۔ مگر تعلیم کے زمانہ میں غیر مذہبی قسم کا انسان بن گیا۔ اس کے بعد دوبارہ جس چیز نے مجھے مذہب کی طرف لوٹایا وہ شاعری تھی۔ انھوں نے بتایا کہ میں مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا۔ وہاں میں نے ٹی ایس ایلیٹ کو پڑھا۔ ٹی ایس ایلیٹ ایک صوفی قسم کا شاعر ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بار بار ویدانت کا حوالہ دیتا ہے۔ ہندستان میں میں ویدانت سے دور ہو چکا تھا مگر انگلینڈ میں ٹی ایس ایلیٹ نے مجھے دوبارہ ویدانت سے قریب کر دیا۔

میرا خیال ہے کہ یہی معاملہ ہر مذہب کا ہے۔ اپنے مذہب کا اعتراف دوسروں کی زبان سے سننا ہر ایک کو بہت متاثر کرتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ یہ دوسرا شخص ترقی یافتہ قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ مسلمانوں کی نسبت سے کرنے کا ایک اہم کام یہ ہے کہ غیر مسلموں نے اسلام کے اعتراف میں جو کچھ لکھا ہے ان کو جمع کر کے شائع کیا جائے۔ یہ ایک نہایت قیمتی ذخیرہ ہے جو مختلف عالمی زبانوں میں موجود ہے۔ اسی کے ساتھ نومسلموں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے جو تاثرات لکھے ہیں وہ بھی بے حد قیمتی ہیں۔ ان کو اگر جمع کر کے شائع کیا جا سکے تو دعوتی نقطۂ نظر سے نہایت جاندار لٹریچر تیار ہو جائے گا۔

اس کانفرنس میں دو ملکوں کے پروفیسر صاحبان شریک تھے۔ امریکہ اور ہندستان۔ امریکی پروفیسر مقابلتاً زیادہ متحرک نظر آئے۔ اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ سنیے۔ کانفرنس کا انتظام اس طرح تھا کہ ایک بڑے ہال کے درمیان بہت سے میز چوکھٹے کی شکل میں بچھائے گئے تھے۔ ان کے درمیان خالی جگہ تھی اور اس خالی جگہ کے بیچ میں کچھ گملے رکھے ہوئے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مائک کے تار سے ٹکرا کر ایک گملا گر گیا۔ اگلے لمحہ میں نے دیکھا ایک سفید فام امریکی گملے کے پاس موجود ہے اور اس کو دوبارہ سیدھا کر کے اپنی جگہ پر رکھ رہا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کس طرح اندر داخل ہوا۔ کیوں کہ گملے کے چاروں طرف میزوں کی چوکور دیوار بنی

ہوئی تھی اور اس میں کہیں " دروازہ " نہ تھا۔ یہ راز اس وقت کھلا جب مذکورہ امریکی اپنا کام کر کے واپس ہوا۔ اس نے اپنی میز کے نیچے سے اکڑوں حالت میں اندر جانے کا راستہ نکالا تھا۔

قدیم طرز کے علماء کے اجتماع میں آپ شرکت کریں تو ہر شخص اس طرح بولے گا گویا اس کو حقیقت کا آخری علم حاصل ہے۔ مگر جدید طرز کے اہل علم کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے ان کے اجتماع میں ہر آدمی اپنے کو گھٹا کر پیش کرتا ہے۔ یہ دور جدید کا اسلوب ہے۔ چنانچہ یہاں بولنے والوں کی زبان سے بار بار اس طرح کے فقرے سننے میں آئے :

I may be wrong.
I dont know whether I am correct.

کانفرنس کا انتظام بہت اچھا تھا۔ اس کی تمام فنی تفصیلات امریکہ (نیویارک) میں طے کی گئی تھیں۔ چنانچہ فنی اور عملی پہلوؤں کے اعتبار سے وہ معیاری حد تک منظم تھی۔ مگر کانفرنس میں چوں کہ ہندستان کے لوگ بھی شریک تھے اس لیے بار بار اس میں " ہندستانیت " کا اظہار ہوتا تھا۔ مثلاً اظہار خیال میں لوگ حدود کی پابندی بہت کم کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی شخص کو اظہار خیال کی دعوت دیتے ہوئے صدر کو یہ کہنا پڑتا تھا :

Please be brief and pointed.

براہ کرم مختصر بولیے اور موضوع پر بولیے۔

اس کانفرنس میں مختلف مذاہب کے تقریباً دو درجن افراد شریک ہوئے۔ ہر آدمی نے کسی متعین موضوع پر ایک مقالہ تیار کیا تھا۔ کارروائی کی صورت یہ تھی کہ ہر آدمی نے اولاً اپنا مقالہ کانفرنس کے امریکی دفتر میں بھیج دیا۔ وہاں منظور ہونے کے بعد مقالات کی فوٹو کاپی تیار کی گئی اور تمام شرکار کے نام ان کو پیشگی طور پر روانہ کر دیا گیا۔ ہر آدمی سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ تمام مقالات پڑھ کر آئے۔

اجتماع میں صاحب مقالہ نے اپنا مقالہ پڑھ کر نہیں سنایا بلکہ ہر مقالہ کا ایک رسپانڈنٹ (Respondent) تھا۔ کسی مقالہ کے بارہ میں سب سے پہلے یہی رسپانڈنٹ بولتا تھا۔ وہ تنقیدی انداز میں مقالہ پر تقریر کرتا تھا۔ رسپانڈنٹ کی تقریر کے بعد عمومی تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ آخر

یں مقالہ نگار تمام اعتراضات کی روشنی میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتا تھا اور اعتراضات کا جواب دیتا تھا۔

میرے مقالہ کے رسپانڈنٹ ڈاکٹر آنند اسپنسر تھے۔ اور خود مجھ کو ڈاکٹر راجندر ورما کے مقالہ کا رسپانڈنٹ بنایا گیا تھا۔ اگلے صفحہ پر ایک فہرست دی جا رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ کانفرنس میں کتنے مقالہ نگار تھے اور کس شخص کو کس مقالہ نگار کا رسپانڈنٹ بنایا گیا تھا۔

کانفرنس میں ایک صاحب نے گاندھی فلسفہ پر مقالہ پیش کیا۔ سوالات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے گاندھی فلم کا ایک واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس فلم کو پندرہ بار دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ گاندھیائی فلسفہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب دونوں طرف مارکاٹ ہو رہی تھی۔ گاندھی جی نے برت رکھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جب تک مارکاٹ ختم نہیں ہوگی میں اپنا برت نہیں توڑوں گا۔ خواہ میں اسی حال میں مرجاؤں۔ اس دوران طرح طرح کے لوگ گاندھی جی سے ملنے کے لیے آئے۔ ان میں سے ایک ہندو نوجوان بھی تھا۔ گاندھی جی کے برت نے اس کے ضمیر کو جگا دیا تھا۔ اس نے آکر کہا کہ باپو جی، مجھے ایسا لگتا ہے میں نرک میں جاؤں گا۔ کیوں کہ میں نے ایک مسلمان بچہ کو مارا ہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ تم نرک میں جانے سے بچ سکتے ہو۔ تم ایسا کرو کہ ایک یتیم مسلمان بچہ کو لے کر اس کی پرورش کرو اور اس کو ایک مسلمان کی حیثیت سے پال کر بڑا کرو:

and raise him as a Muslim.

مقرر نے کہا کہ یہ واقعہ گاندھی جی کے فلسفہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتا رہا ہے۔

کانفرنس کے شرکاء میں ایک خصوصی شخصیت ڈاکٹر شیشاگری راؤ کی تھی۔ وہ کولار (کرناٹک) کے باشندے ہیں۔ مگر عرصہ سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ وہاں وہ ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ موجودہ کانفرنس کی کئی نشستوں میں انھوں نے صدارت کا فریضہ انجام دیا۔

ایک بار اتفاقاً ختنہ کا ذکر آگیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہر مذہب میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو سمجھ سے بالاتر ہیں۔ انھیں میں سے اسلام کا ختنہ کا طریقہ بھی ہے۔ ڈاکٹر شیشاگری راؤ

CWR

Council
For the World's
Religions

COUNCIL FOR THE WORLD'S RELIGIONS

"Religious Harmony: Problems and Possibilities"
Bangalore, India

June 26 - 30, 1986

BANGALORE CONFERENCE
Agenda Supplement

Session	Author	Respondent
I	Ali, Syed Ausaf	Umarani, R. I.
II	Bhaskar, Bhagchandra Jain	Ramamurthy, A.
III	Chirappanath, Antony K	Bryant, M. Darrol
IV	Devadoss, T. S.	Verma, Rajendra D.
V	Dhalla, Homi B.	Singh, Avtar
VI	Kareem, A. Abdul	Tulpule, S. G.
VII	Khan, M. Wahiduddin	Spencer, Anand
VIII	Mahadevappa, N. G.	Talib, G. S.
IX	Ramamurthy, A.	Singh, Wazir
X	Rothermund, Indira	Mahadaveppa, N. G.
XI	Sarmadee, Shahab	Devadoss, T. S.
XII	Singh, Avtar	Chirappanath, Antony
XIII	Singh, Wazir	Ali, Syed Ausaf
XIV	Spencer, Anand	Kareem, A. Abdul
XV	Talib, G. S.	Rothermund, Indira
XVI	Tulpule, S. G.	Sarmadee, Shahab
XVII	Umarani, R. I.	Dhalla, Homi B.
XVIII	Verma, Rajendra D.	Khan, M. Wahiduddin

اس گفتگو کو سن رہے تھے۔ بظاہر وہ سمجھ نہ سکے کہ "ختنہ" کیا چیز ہے۔ تاہم کچھ دیر کے بعد انھوں نے سمجھ لیا۔ انھوں نے کہا: آپ کی مراد غالباً Circumcision سے ہے۔ کہا گیا کہ ہاں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو بہت عمدہ چیز ہے۔ میں نے خود اپنا ختنہ کرایا ہے۔ صحت کے اعتبار سے یہ طریقہ نہایت عمدہ ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگ مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی ختنہ کرا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر شیشاگری کی زبان سے یہ بات سن کر سب لوگ چپ ہو گیے۔

پارسی مذہب کے نمائندہ (ڈاکٹر دومی دھلّا) نے کہا کہ پارسی مذہب ایک غیر تبلیغی مذہب ہے۔ پارسیوں کا خیال ہے کہ اگر ہم دوسروں کا مذہب بدل کر انھیں اپنے مذہب میں داخل کریں تو اس سے ہمارے مذہب کی (Purity) متاثر ہو جائے گی۔ اس طرح پارسی مذہب واحد مذہب ہے جو سماج کو غیر ضروری جھگڑوں سے بچاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پارسی مذہب نے پارسیوں کے اندر غیر معمولی تعمیری استعداد پیدا کی ہے۔ ہندستان میں مذہبی تشدد نہ ہونے کی وجہ سے یہاں پارسیوں کو موقع ملا اور انھوں نے ملک کی تعمیر و ترقی میں زبردست حصہ لیا۔ اس کے برعکس ایران میں بھی کچھ پارسی ہیں مگر وہاں مسلمانوں کے مذہبی تشدد کی وجہ سے پارسی ملکی خدمت کا کوئی نمایاں کام نہ کر سکے۔

ہندو مذہب کے نمائندہ نے کہا کہ "انسانی اخوت سب سے زیادہ ہندوازم کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ہندوازم وحدت حقیقت میں یقین رکھتا ہے۔ جب کہ دوسرے کئی مذاہب ثنویت کو مانتے ہیں۔" اس طرح ہر مذہبی گروہ نے بطور خود ایک معیار بنا رکھا ہے۔ اور اس معیار کے خانہ میں اپنے آپ کو رکھ کر خوش ہیں کہ ہمارا مذہب سب سے زیادہ اعلیٰ مذہب ہے۔ مسلمانوں کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ مختلف نہیں۔ انھوں نے بھی اپنے حسب حال کچھ معیار تلاش کر لیے ہیں اور یہ عقیدہ بنا کر خوش ہیں کہ ہمارا مذہب سب سے افضل مذہب ہے ——— ہر ایک صرف اپنی بڑائی کو پا کر نازاں ہے۔ خدا کی بڑائی کو پا کر سرشار ہونے والا کوئی نہیں۔

اس سفر کے دوران بہت سی دل چسپ ملاقاتیں ہوئیں۔

ایک غیر مسلم اسکالر سے میں نے کہا کہ اصلاً تمام مذاہب ایک ہی تھے۔ مگر بعد کے زمانوں

میں جو بگاڑ ہوا۔ اس نے اصلی مذہبی تعلیمات کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ مثلاً انسان کے مقام کو لیجیے ہندو عقائد میں انسان کو نیچی ذات اور اونچی ذات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ عیسائیت میں سارے انسان پیدائشی گنہ گار ہیں۔ یہودیت میں خدا کا سارا انعام و اکرام ایک خاص نسل (بنی اسرائیل) کے لیے مخصوص ہے۔ مگر اسلام محفوظ مذہب ہے۔ اس لیے اسلام میں کوئی ایسی چیز نہیں۔ انھوں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ انسان کا احترام جو اسلام میں ہے وہ کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

ایک ہندو پروفیسر سے توحید کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ توحید کا تصور صرف اسلام کی خصوصیت نہیں۔ توحید کا تصور ویدوں اور اپنشدوں میں بھی موجود ہے میں نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق یہ بات صحیح نہیں۔ اسلام میں خدا کا تصور یہ ہے کہ وہ ہم سے الگ ایک مستقل ہستی رکھتا ہے۔ جب کہ ویدوں کا تصور خدا، ہندو شارحین کے مطابق "ادویت واد" ہے۔ یعنی یہ کہ خدا اور دوسری موجودات سب کے سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ جب کہ اسلام میں خالق الگ ہے اور مخلوق الگ۔

میں نے کہا کہ ایک بار میں دہلی کے ایک اجتماع میں ایک ہندو عالم کی تقریر سن رہا تھا۔ جو اسی خاص موضوع پر تھی۔ انھوں نے ہندو عقیدۂ خدا کو واضح کرتے ہوئے کہا:

سو دیر از نو ڈفرنس بٹوین جی اُو ڈی اینڈ ڈی اُو جی

مذکورہ ہندو پروفیسر یہ سن کر مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔ بظاہر ان کی خاموشی اس بات کا اعتراف تھی کہ آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ بطور واقعہ درست ہے۔

ڈاکٹر مہندر سنگھ (ڈائرکٹر گرونانک فاؤنڈیشن نئی دہلی) سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ بابا گرونانک کے یہاں وحدانیت کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کا ماخذ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ آج کل کچھ اسکالر یہ ثابت کرنے کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا ماخذ وید اور اپنشد ہیں، مگر خالص علمی اعتبار سے یہ درست نہیں۔ میں نے کہا کہ گرونانک کے یہاں واضح طور پر توحید (Monotheism) کا تصور ہے، جب کہ وید اور اپنشد میں جو چیز پائی جاتی ہے وہ وحدت وجود (Monism) ہے۔ اس لیے گرونانک کا وحدانیت کا عقیدہ اسلام سے ماخوذ ہو سکتا ہے، وہ

اپنشد سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر مہندر سنگھ نے میری بات سن کر کہا:

I agree with your opinion.

سردار جوگندر سنگھ نے فلسفہ میں ایم اے کیا ہے۔ ان کا خاص موضوع مذاہب کا تقابلی مطالعہ ہے۔ پہلے وہ ایک سرکاری ملازمت میں تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ ایک انگریزی ماہنامہ کے ایڈیٹر ہیں۔ ان سے موجودہ سماجی بگاڑ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ اس عمومی بگاڑ کو قانون سازی کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بگاڑ مزاجوں کے بگاڑ سے آیا ہے اور مزاجوں کی اصلاح سے ہی اس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس بگاڑ کا خاص سبب یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے جواب دہی (Accountability) کا احساس ختم ہو گیا ہے، اب اصلاح کی واحد شکل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر دوبارہ یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں بالآخر انھیں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔ سردار جوگندر سنگھ نے اس نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔

پروفیسر وزیر سنگھ (پٹیالہ یونیورسٹی) سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ پنجاب میں موجودہ گڑبڑ کے باوجود گیہوں کی پیداوار پچھلے سالوں سے زیادہ ہوئی ہے یہ سکھ قوم کی انوکھی خصوصیت ہے کہ ایک طرف وہ تشدد میں جنون کی حد تک پہونچ گیے ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنے کھیتوں اور فارموں پر کام کر کے بدستور زبردست پیداوار حاصل کر رہے ہیں۔ تاہم پروفیسر وزیر سنگھ نے تسلیم کیا کہ صنعتی پیداوار میں فرق پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صنعت کو چلانے کے لیے باہر کے افراد بھی درکار ہوتے ہیں اور موجودہ گڑبڑ کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آمد پر کافی اثر پڑا ہے۔

ایک غیر مسلم اسکالر نے بڑے زور و شور کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا کہ ہم کو ہر مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔ حتی کہ ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ اس کے بعد ۲۷ جون کو جمعہ کا دن تھا۔ میں دوپہر کو ہوٹل سے نکل کر مسجد کے لیے روانہ ہوا تو اتفاق سے مذکورہ اسکالر مل گیے۔ جب میں نے بتایا کہ مسجد میں نماز کے لیے جا رہا ہوں تو ان کی زبان سے نکلا:

کیا مسجد ہی میں خدا ہے، یہاں خدا نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ حضرات اپنی باتوں میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ورنہ آپ اس کی حقیقت بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ مسجد میں باجماعت نماز اس لیے ادا نہیں کی جاتی کہ وہاں خدا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی مشترک جگہ مقرر کرنی ہوگی۔ جیسے اپنی کانفرنس کے لیے آپ نے ایک ہال کو مخصوص کیا ہے۔ اگر ایک ہال متعین نہ کیا جائے تو مشترک اجتماع کیسے ہو سکتا ہے۔

اس زمانہ کا ایک عجیب مسئلہ تخصص (Specialization) ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر عالم صرف "جزء" کا عالم ہے۔ "کل" کا کوئی عالم نہیں۔ اس کی توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ کل کا علم بے حد مشکل ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جزء کا علم اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ ہر جزء اپنے کُل سے اس طرح وابستہ ہوتا ہے کہ جزء اور کل کے درمیان نسبت کو جانے بغیر تنہا جزء کو سمجھنا بے حد دشوار ہے۔

میں ایک سکھ اسکالر سے ملا۔ ان سے میں سکھ مذہب کی بعض بنیادی باتوں پر تبادلہ خیال کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے سکھ ہسٹری پر اسپشلائز کیا ہے، اس لیے میں آپ کے سوالات کا جواب نہ دے سکوں گا۔ اس کے بعد میں دوسرے سکھ پروفیسر سے ملا۔ انھوں نے کہا کہ میں سکھ فلاسفی کا طالب علم ہوں۔ اور آپ کے سوالات کا تعلق سکھ تھیالوجی سے ہے۔ اس لیے میں اس پر گفتگو کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ کسی ایسے شخص کا نام بتائیے جو سکھ تھیالوجی پر اکسپرٹ کی حیثیت رکھتا ہو۔ انھوں نے کچھ دیر سوچا۔ اس کے بعد ایک سکھ عالم کا نام لیا اور کہا: "وہ سکھ تھیالوجی کے مستند عالم ہیں۔" میں ان سے مذکورہ بزرگ کا پتہ پوچھنے والا تھا کہ انھوں نے کہا "مگر افسوس کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

ایک مرتبہ میں ہوٹل میں چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک پروفیسر مجھ کو کئی بار اس طرح خاموشی کی حالت میں دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

You are observing what is called in Buddhism 'thundering silence'.

آپ اس حالت میں ہیں جس کو بدھزم میں پرشور خاموشی کہا جاتا ہے۔

امریکہ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام اسٹیو سکلر ہے۔

(Steve Sklar) ہے۔ وہ اسلام سے متاثر تھے مگر وہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں سے سخت نالاں تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کئی مشہور مسلم مصنفین کے نام لیے اور کہا کہ میں نے ان کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں۔ مگر یہ کتابیں مجھے دعوتی نقطہ نظر سے کوڑا (Rubbish) معلوم ہوئیں۔

میں نے پوچھا کہ ان کتابوں کے بارہ میں آپ کی اتنی سخت رائے کیوں ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے کئی باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کتابوں میں اکثر اسلام کا مقابلہ مغربی تہذیب سے کیا جاتا ہے۔ میں مغربی تہذیب کا وکیل نہیں ہوں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے تقابل کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ سراسر غیر علمی ہے۔ مثلاً ان کتابوں میں عام طور پر آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کیا گیا ہے۔ اسلام کی نمائندگی کے لیے تو قرآن و حدیث کا کوئی اقتباس لے لیا گیا ہے۔ اور مغرب کی نمائندگی کے لیے اس کا کوئی عملی واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ برابری کا تقابل نہیں۔

آپ کو تقابل کرنا ہے تو آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پریکٹس کا تقابل پریکٹس سے کیجئے۔ مثلاً اسلام میں حقوق انسانی کو بتانے کے لیے اگر آپ خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ پیش کر رہے ہیں تو مغرب میں حقوق انسانی کے تصور کو بتانے کے لیے اقوام متحدہ کا چارٹر پیش کیجئے۔

انھوں نے کہا کہ ان کتابوں میں اگر کہیں عمل کا تقابل عمل سے ہے تو وہاں بھی ایک غلط قسم کی تعمیم (Generalization) پائی جاتی ہے۔ وہاں یہ کیا گیا ہے کہ اسلام کی تاریخ سے تو ایک اچھا واقعہ چن لیا گیا ہے اور اس کو اسلام کی عمومی حالت بتایا گیا ہے۔ دوسری طرف مغربی معاشرہ سے ایک برا واقعہ تلاش کر کے لیا گیا ہے اور اس کو اس طرح پیش کیا گیا ہے گویا یہی مغرب کی عام حالت ہو۔ حالاں کہ یہ دونوں ہی باتیں واقعہ کے خلاف ہیں۔

انھوں نے الرسالہ (انگریزی) کے کچھ شمارے دیکھے۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ انھوں نے کہا کہ جس انداز میں آپ اسلام کو پیش کر رہے ہیں اگر اس انداز میں اسلام کو اہل مغرب کے سامنے لایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ان کو متاثر کرے گا۔

ڈاکٹر اوصاف علی صاحب خالص علمی مزاج کے آدمی ہیں۔ مطالعہ وسیع ہے اور انگریزی پر بخوبی قدرت حاصل ہے۔ ان سے بہت دل چسپ ملاقاتیں ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں ایک کتاب الکلام کے بارہ میں چھپی ہے جس کا نام ہے :

The Philosophy of Kalam

اس کے مصنف پروفیسر وولف سن (Prof. Wolfson) ہیں۔ حال میں بڑھاپے کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مذکورہ کتاب کی تیاری میں انھوں نے بیس سال گزار دیئے۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی اس سلسلہ میں انھیں مالیات فراہم کر رہی تھی چنانچہ اس نے ۲۰ سال میں تقریباً تین کرور روپے انھیں دیئے۔

پروفیسر وولف سن رات دن تحقیق اور مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ ایک بار ان کا ایک دوست ان کے کمرے میں آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کمرہ میں بو آرہی ہے۔ اس نے پروفیسر موصوف سے پوچھا: کیا آپ اپنے کمرہ کی صفائی نہیں کراتے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ دوست نے دوبارہ پوچھا کہ کیوں۔ انھوں نے جواب دیا، تم دیکھتے ہو یہاں کس طرح میرے کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ صفائی کرنے والی خاتون آئے گی تو میرے کاغذات اِدھر اُدھر کر دے گی۔ میرا ذہن ڈسٹرب ہوجائے گا۔

ایک بار تلفظ کے فرق کی بات ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اوصاف علی صاحب نے اس سلسلہ میں کئی دل چسپ واقعات بتائے۔ وہ حج کے سلسلے میں عرب گئے ہوئے تھے۔ ایک بار سفر کرتے ہوئے پیچھے کی گاڑی کے ڈرائیور نے چلا کر کہا : گَدِّم گلیل۔ وہ عربی زبان جانتے ہیں مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ پوچھنے پر ان کے ساتھی نے کہا کہ وہ کہہ رہا ہے: قَدِّم قلیل (تھوڑا آگے بڑھو) اسی طرح ان کے یہاں ایک امریکن آئے۔ ایک ہندستانی نے ان سے بات کرتے ہوئے ” ماس کیٹو“ کا لفظ استعمال کیا۔ امریکی پروفیسر کی سمجھ میں یہ لفظ نہ آسکا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اوصاف علی نے امریکی لہجے میں کہا کہ وہ کہہ رہے ہیں ”مس کی ٹو“ تب وہ سمجھا کہ ہندستانی آدمی کی مراد مچھر سے تھی۔

نراد چودھری لندن میں رہتے ہیں اور ہندستان کے زبردست ناقد ہیں۔ ڈاکٹر

اوصاف علی صاحب سے ان کی بار بار ملاقات ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا کہ نراد چودھری میں یہ منفی ذہن کیسے پیدا ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے نراد چودھری ہندستان میں تھے۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں کام کر رہے تھے۔ مگر وہ "نیوز ریڈر" سے زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ ان کو نہ پروموشن مل سکا اور نہ ریڈیو میں کوئی بڑا عہدہ۔ چنانچہ وہ ہندستان چھوڑ کر لندن چلے گئے ——— یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ کس طرح آدمی ذاتی شکایت کو قومی شکایت بنا لیتا ہے۔

انڈین اکسپریس کے بنگلور اڈیشن (۳۰ جون ۱۹۸۶) میں ایک دل چسپ رپورٹ پڑھی اس کا عنوان تھا شیر کی کہانی (Tiger Story) ایک ملکی خبر رساں ایجنسی نے شموگا کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک خبر نشر کی جو تمام اخبارات میں نمایاں طور پر چھپی۔ یہ ایک شخص (عطاء اللہ) کی بہادری کی داستان تھی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ ۱۸ جون ۱۹۸۶ کو سولہ سالہ عطاء اللہ شموگا کے ایک گاؤں، ہُسور کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک شیر برآمد ہوا اور اس نے عطاء اللہ کے دوستوں پر حملہ کر دیا۔ عطاء اللہ اگرچہ اس مقابلہ میں زخمی ہو گیا مگر اس نے شیر سے لڑ کر اسے بھگا دیا اور اب وہ اسپتال میں داخل ہے۔

شموگا کے ایک نامہ نگار مسٹر ارن اس کا قصہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

> This correspondent who was cursing himself for having missed out on a good story, wanted to verify the story from the authorities concerned.

یہ نامہ نگار اپنے کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ وہ اتنی اچھی کہانی کی رپورٹ نہ کر سکا۔ اس نے چاہا کہ متعلقہ ذمہ داروں سے اس کی تصدیق حاصل کرے۔ چنانچہ مسٹر ارن نے مسٹر لکشمن کنزرویٹر آف فارسٹس) کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ایسے کسی واقعہ کا علم نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مسٹر بی کے سنگھ (ڈپٹی کنزرویٹر) کو ٹیلی فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے یہاں ایسی کوئی خبر نہیں سنی۔ البتہ دہلی کے اخبار میں پڑھ کر وہاں سے میرے ایک دوست نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ قصہ صرف یہ ہے کہ مذکورہ عطاء اللہ اور اس کے دوست ہُسور کے علاقہ سے شام کے وقت گزر رہے تھے کہ ایک جنگلی کتا نکل کر

حملہ آور ہوا۔ اس کو دیکھ کر عطاء اللہ نے شور وغل کیا تو کتا بھاگ گیا۔ ایک بچہ کو معمولی زخم آیا ——— کتے کی کہانی شیر کی کہانی بن گئی۔

قدیم زمانہ کے "بزرگوں" کے بارہ میں جو طرح طرح کے کراماتی قصے مشہور ہیں ان کی حقیقت بس یہی ہے۔ لوگوں کی عجوبہ پسندی نے ایک معمولی واقعہ کو عجیب وعزیب کرشمہ بنا کر مشہور کر دیا۔ اس زمانے میں تحقیق کے ذرائع نہ تھے، اس لیے قصہ یک طرفہ طور پر پھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ مقدس بن گیا۔ اور یہ امکان ہی باقی نہ رہا کہ کوئی شخص اس کی تحقیق کرے اور کوئی ہو جو اس کی تحقیق پر دھیان دے۔

۲۹ جون کی شام تک مسلسل مشغولیت رہی۔ البتہ ۳۰ جون کو صبح سے دوپہر تک خالی تھا۔ چنانچہ ۳۰ جون کو شہر کے بہت سے لوگ ملنے کے لیے آگئے۔ یہ شہر کے معزز اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ کئی گھنٹہ تک ان لوگوں سے گفتگو ہوتی رہی۔ ان لوگوں نے چاہا کہ میں مزید چند دن بنگلور میں رکوں اور یہاں شہر میں خطابات کے پروگرام رکھے جائیں۔ مگر میرے پاس رکنے کا موقع نہیں تھا۔ اس لیے میں معذرت کر کے ۳۰ جون کی شام کو دہلی واپس آگیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ میں اعراض پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اگر ہم اعراض کی پالیسی پر چلیں تو فریق ثانی دلیر ہو جائے گا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ فساد کرے گا۔ میں نے کہا کہ اعراض کا حکم تو خود خدا نے دیا ہے، پھر آپ کو اعتراض خدا پر کرنا چاہیے نہ کہ میرے اوپر۔

میں نے کہا کہ اعراض کا مقصد فساد کو ختم کرنا ہے نہ کہ فساد کو بڑھانا۔ ایک صحابی نے آخر عمر میں اپنے لڑکے کو نصیحت کی تو انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ: جو شخص نادان کے چھوٹے شر کو برداشت نہیں کرے گا اس کو نادان کے بڑے شر کو برداشت کرنا پڑے گا۔ (من لا یرضی بالقلیل مما یاتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر)

صحابی کی اس نصیحت کی روشنی میں غور کیجئے تو مسلمانوں کی سوچ اس کے مقابلہ میں بالکل الٹی ہو گئی ہے۔ صحابی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ فسادی کی چھوٹی شرارت کو برداشت کرلو

توتم اس کی بڑی شرارت سے بچ جاؤ گے ، اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ فسادی کی چھوٹی شرارت کو برداشت نہ کرو ورنہ وہ تمہارے ساتھ بڑی شرارت کرے گا۔ کوئی شخص یہ کہے کہ اصحاب رسول باتوں کو نہیں سمجھتے تھے تو تمام مسلمان اس سے لڑ جائیں گے مسلمان خود اپنی روش سے اصحاب پر یہی الزام عاید کر رہے ہیں ۔

بنگلور میں الرسالہ (اردو ، انگریزی) کافی تعداد میں آرہا ہے۔ تاج محمد صاحب نے بتایا کہ بنگلور سے کئی اردو اخبار نکلتے ہیں اور وہ اکثر الرسالہ کے مضامین حوالہ کے ساتھ چھاپتے ہیں ۔ وہ اپنے ساتھ دو تازہ اخبار لائے تھے۔ ایک روزنامہ پاسبان (۱۹ جون ۱۹۸۶) تھا جس نے الرسالہ کا ایک مضمون (کھال بولے گی) حوالہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ دوسرے ، ہفت روزہ تکبیر (۲۷ جون) جس میں صفحہ ۶ پر الرسالہ کا ایک مضمون حوالہ کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔

نئی مطبوعات

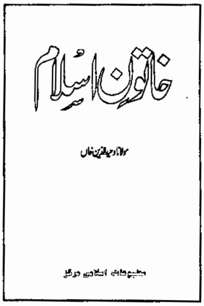
خاتونِ اسلام
مولانا وحید الدین خاں
مطبوعات اسلامی مرکز

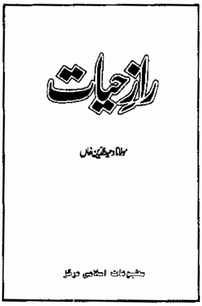
رازِ حیات
مولانا وحید الدین خاں
مطبوعات اسلامی مرکز

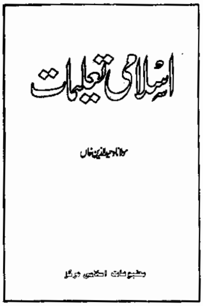
اسلامی تعلیمات
مولانا وحید الدین خاں
مطبوعات اسلامی مرکز

صفحات ۱۹۲ ۳۰ روپیہ
صفحات ۲۸۰ ۴۸ روپیہ
صفحات ۱۴۴ ۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

خبرنامہ اسلامی مرکز — ۲۶

۱۔ مولانا افاض الدین ندوی (دارنگ) نے اطلاع دی ہے کہ انھوں نے "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا آسامی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور اس کو چھپوا کر آسامی بولنے والوں کے درمیان پھیلا رہے ہیں۔ آئندہ وہ مزید کتابوں کا ترجمہ آسامی زبان میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ جمشید پور میں ۷ نومبر سے ۱۶ نومبر ۱۹۸۶ تک کتابوں کی نمائش ہوئی۔ اس نمائش کا اہتمام ٹیگور سوسائٹی نے کیا تھا۔ اس موقع پر "آزاد کتاب گھر" کی طرف سے اسلامی مرکز کی کتابوں کا اسٹال بھی لگایا۔

۳۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ کو نئی دہلی میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع تھا۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک تقریر میں بتایا کہ مذہب اور روحانیت کیا ہے اور مذہبی یا روحانی آدمی ہونے کی پہچان کیا ہے۔

۴۔ ۱۵ نومبر ۱۹۸۶ کی شام کو نئی دہلی (رابرٹ اسکوئر) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع سیرت رسول تھا۔ تقریر میں سیرت کے واقعات کے ذریعہ بتایا گیا کہ سیرت کی روشنی میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے کیا رہنمائی ملتی ہے۔

۵۔ الرسالہ کیسٹ ابتداءً ماہانہ کیسٹ کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ مگر بعد کو ماہانہ بنیاد پر اس کا التزام باقی نہ رہ سکا۔ اب کیسٹ کا سلسلہ غیر ماہانہ بنیادوں پر چلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ساتواں کیسٹ اس وقت زیر تیاری ہے۔

۶۔ اسلامک کلچرل سوسائٹی (دہلی) کے زیر اہتمام جامع مسجد دہلی کے علاقہ میں سیرت النبی کا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو خصوصی مقرر کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے اس جلسہ میں تقریباً ایک گھنٹہ کی تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا: سیرت کا پیغام عصر حاضر کے نام۔ یہ جلسہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۶ (۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ) کو ہوا۔ اس میں دہلی کے مسلمانوں کے علاوہ کچھ غیر مسلم صاحبان بھی شریک ہوئے۔

۷۔ الرسالہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ لوگ تحفہ کے طور پر الرسالہ (اردو اور انگریزی) کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام جاری کرائیں۔ اس سلسلہ میں تقریباً روزانہ ڈاک سے ایسے خطوط موصول ہو رہے ہیں جن میں لوگ پتے بھیجتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کی طرف سے الرسالہ ان پتوں پر جاری کر دیا جائے۔ یہاں نمونہ کے طور پر اس قسم کا ایک خط نقل کیا جاتا ہے:

Kindly find enclosed **postal** orders for Rs. 96/- for one year subscription renewal of 'Al-Risala' for my wife Dr. Kanak Bhargava, Ellesmore, Nainital, and the balance Rs. 48/- is towards a one year gift subscription for: Mr S M Arif, Arif Castles, Nainital.
Kindly do the needful in the matter.

Raj Kumar Ranjit Bhargava, Newal Kishore Residence,
75-Hazratganj, Lucknow-226 001

۸۔ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر چندر اچوڑ جنھوں نے شاہ بانو کے مشہور کیس میں فیصلہ دیا تھا، ان کی ایک تقریر اس بارہ میں دہلی میں ہوئی اور اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس سلسلہ میں صدر اسلامی مرکز نے اپنا ایک خط انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۷ اکتوبر ۱۹۸۶) میں شائع کرایا۔ یہ خط مکمل طور پر اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

۹۔ الرسالہ اکیڈمی حیدرآباد کی جانب سے الرسالہ بک اسٹال اور فری بک لائبریری کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس نظام کے تحت حیدرآباد میں اجتماعی مواقع پر الرسالہ اور مطبوعات اسلامی مرکز کا اسٹال لگایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مطالعہ کے لیے مفت کتابوں کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ حیدرآباد کے اصحاب اس سلسلہ میں حسب ذیل پتہ پر رابطہ قائم فرمائیں: الرسالہ بک اسٹال اینڈ فری بک لائبریری، مکان نمبر 3-5-780/19/2 روبرو اعظم منزل شادی خانہ، کنگ کوٹھی، حیدرآباد۔ فون نمبر 231607 نیز مذکورہ فون نمبر پر مقامی خواہش مند حضرات کتابوں کا آرڈر دے سکتے ہیں۔ مطلوبہ کتابیں ان کے گھر تک پہونچا دی جائیں گی۔

Women's status in Islam

Sir,— Addressing the Bar Council of India convention recently on the Uniform Civil Code, former Supreme Court Chief Justice Y.V. Chandrachud reportedly confessed to having "gone out of his way" to invoke Article 44 in the judgement in the Shah Bano case to remind the Government of its constitutional allegations to implement a uniform civil code in the country. But he has yet to offer one more apology. It concerns the remark he made in his judgement on the status of women in Islam—a remark in which he has likewise "gone out of his way" considering that it indisputably casts aspersions on Islam itself.

He alleged that women had "traditionally" been subjected to unjust treatment and that the "fatal point in Islam is the degradation of women". To support this he quoted Manu's dictum that woman did not "deserve independence" along with an observation allegedly made by the Prophet of Islam that "woman was made from a crooked rib and if you try to bend it straight it will break, therefore, treat your wives kindly". While Manu's dictum bears out his statement, I must point out that he has badly misquoted the Prophet. Nowhere in the Hadith (Prophet's sayings) is it stated that woman was made from a crooked rib, this being an ancient biblical version of God's creation of human life. The word 'rib' was used by the Prophet in a purely metaphorical sense and his actual words were: "Woman is like a rib, if you try to straighten her out, it will break, so treat her kindly."

Presumably the Prophet, with his understanding of human nature, had a fine intuitive grasp of the fundamental biological and psychological differences between men and women, particularly the latters' fragility and passivity—and, for this reason, found it necessary to admonish lesser men to treat their wives kindly. I fail to see how "the degradation of women" can ensue from such an injunction — Yours etc.'

WAHIDUDDIN KHAN
President,
The Islamic Centre,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi-110013.

Hindustan Times, 27 October 1986

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

زرتعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۵ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

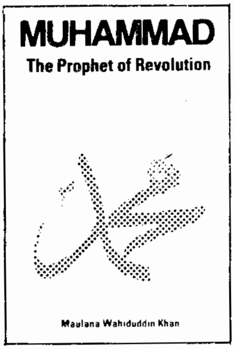
MUHAMMAD
The Prophet of Revolution
Maulana Wahiduddin Khan

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By
Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi-110013

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 No 122 January 1987

GIFTING The Word of God

To spread the word of God is the highest form of charity. It appeals to the mind, the heart, the soul, that being the earnest endeavour of this magazine, how noble-spirited it would be of you, dear readers, if you sent it on regularly to friends and relatives. Make a **GIFT** of it. Think of a whole year's subscription as being both a delightful present as well as a contribution to a worthy cause.

Please send AL-RISALA to my friend/ relative to the following address:

Name ....

Address ....

....

....

(Please use separate sheet for more than one address)

I am enclosing cheque/Postal Order/ Bank Draft/M.O. Receipt No. ....

Please tick box where applicable

☐ URDU
☐ ENGLISH
☐ ONE YEAR
☐ TWO YEARS

Annual Subscription Rates

INLAND	RS. 48
ABROAD	
By air-mail	$ 20
By surface mail	$ 10

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
ALRISALA C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

GIFT AL-RISALA TO YOUR FRIENDS & RELATIVES

Rs 4